مرثیہ معلّٰی

آغا سکندر مہدی

مرثیۂ معلّیٰ

آغا سکندر مہدی

حقی آفسٹ پریس - کراچی

پیارے بھائی جان

سید حیدر مہدی رضوی

کے

نام

مرثیہ معلّیٰ

۱۔ تعارف "آغا صاحب"

از پروفیسر حشمت جہاں ناز ایم، اے۔

۲۔ "جو ملا مجھ کو وہ توفیق الٰہی سے ملا"

از آغا سکندر مہدی۔

۳۔ "مرثیہ نور کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے"۔

تبصرہ: جناب سید انصار حسین نفیسؔ فتح پوری

۴۔ "مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل"

تبصرہ: ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔

۵۔ حامل رائیت اقلیم وفا ہیں عباس۔

تبصرہ: پروفیسر جناب سید علی اختر زیدی ایم۔ اے۔

۶۔ "ہے آج پھر قلم نکتہ رس وقار سخن"

تبصرہ: ڈاکٹر سید اسد علی اریب ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔

۷۔ "فیصلہ حر کا طمانچہ تھا بہ رخسار یزید"

تبصرہ: جناب سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغا صاحب

آغا بھائی جان۔ جگت آغا صاحب ہیں، گھر کے بچے۔ نوکر چاکر، امیر غریب سب ان کو آغا جی کہہ کر پکارتے ہیں۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو ان کے اصلی نام سے واقف ہوں گے۔ ان کی عرفیّت آغا ہے۔ ان کا تخلص آغا ہے۔ ان کا رشتہ آغا ہے اور غالباً ان کا رتبہ اور عہدہ بھی آغا ہے۔ ان کے افسر بھی آغا جی کہتے ہیں اور ماتحت بھی — جہاں رہے شہر کے گلی کوچوں میں آغا صاحب کے نام سے مشہور رہے۔ اسٹیشن سے لیکر گھر تک ہر آنے جانے والا آغا صاحب کو جانتا ہے۔ یہ نہیں معلوم وہ کیا کرتے ہیں کہاں کے رہنے والے ہیں، مگر جس سے پوچھئے وہ آغا صاحب کو جانتا ہے۔ رشتہ داروں میں وہ مقبول۔ بہن بھائیوں کے وہ چہیتے۔ اپنے محکمہ میں وہ معروف۔ طلباء ان کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ مشاعروں میں ان کا چراغ جلتا ہے۔ مجلسِ عزا میں روحِ رواں رہتے ہیں۔ بچوں میں وہ مشہور — بوڑھوں میں ان کا انتظار۔ غرضیکہ آغا صاحب کیا ہیں۔ بہتا دریا ہیں۔ میٹھے پانی کا جھرنا ہیں۔ ہر محفل کی جان ہر مجلس کی شان۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھا ان کو اسی رنگ میں پایا۔ دوستوں کے بھی دوست اور دشمنوں کے بھی دوست ہیں۔ بچپن ہی سے محفل

آرائی کے شوقین۔ ان کی مقبولیت کا باعث غالباً ان کی ہمہ رنگ طبیعت اور خلوص و نیک نیتی ہے۔ لاہور میں ایک بار ان کو اپنے زمانۂ طالب علمی کے ایک جاننے والے مل گئے۔ جن کی مالی حالت بہت خراب تھی گھر لاکر ان کی بہت خاطر مدارات کی کچھ مالی امداد بھی کی۔ رات بھر وہ ہمارے گھر ہی سوئے صبح نماز سے پہلے اٹھ کر لحاف سمیت چلتے بنے۔ ہم لوگوں کو ان کی اس حرکت پر بہت غصّہ آیا۔ مگر آغا بھائی جان کچھ نہ بولے۔ کچھ دنوں کے بعد وہی صاحب انہیں پھر بازار میں ملے۔ آغا بھائی دوبارہ ان سے اسی خلوص سے ملے اور اشارۃً بھی ایک لفظ ایسا نہیں کہا جس سے وہ شرمندہ ہوتے۔

دوسروں کی مدد کرنے میں ان کو خاص لذّت ملتی ہے خواہ اس کے لئے اُن کو خود تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے۔ حسن ابدال کے دوران قیام میں ایک صاحب ان کے پاس آئے اور اپنی مفلسی کا رونا دیر تک روتے رہے۔ اتفاق کہیئے کہ اس زمانہ میں خود آغا صاحب مالی پریشانیوں سے دوچار تھے مدد کرنا مشکل تھا۔ مگر فوراً ایک رقعہ کسی کریانہ اسٹور کے نام لکھ کر بے شمار سامان کھانے پینے کا منگا کر ان کے حوالے کیا

لاتعداد طلبا ان کے یہاں کھانا کھاتے، سوتے اور پڑھتے باہر کے تمام کمرے طلبا سے بھرے رہتے۔

حُقّہ پینے کی عادت بھی ان کی انفرادی شان ہے۔ علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی سے ہی حقّہ پیتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا بھئی یہ حقّہ کی لت

یکوں لگائی، کہتے "لوگوں پر اپنی بزرگی کا رعب ڈالنے کے لئے"۔ حقّہ سفر وحضر میں ساتھ رہتا ہے، علی گڑھ کی یادگار ہے ہمارے لئے باعثِ بیگار ہے۔ عمدہ کھانے، عمدہ چائے اور خوشبودار تنباکو کے رسیا ہیں۔

بلا کے وضعدار ہیں۔ جس بات کو پسند کرتے ہیں ہمیشہ اسی پر کاربند رہیں گے۔ ان کا ایک بہت پرانا ملازم تھا جس کو ہم سب بھائی بہن سرور چاچا کہا کرتے تھے۔ وہ رہتا بھی چچاؤں کی طرح تھا۔ کیا مجال جو گھر کا ایک کام بھی کرتا ہو، صرف آغاجی کو چمکتے ہوئے برتنوں میں چائے بناکر دیتا۔ ہم سب اسکی کاہلی اور "نکمے" پن سے سخت نالاں تھے، مگر آغا بھائی جان ہمیشہ اس کی تعریف کرتے یہاں تک کہ جب وہ اپنے وطن جاکر مہینوں بلکہ سالوں رہتا۔ تب بھی اسکی تنخواہ بھیجتے رہتے۔ کپڑے بناکر دیتے یہاں تک کہ آخر وقت میں بھی وہ یہیں آگیا۔ کام کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا الٹا ہم لوگوں کو اسکی خدمت بھی کرنا پڑی اور جب تک وہ مر نہیں گیا، اسکی جگہ دوسرا نوکر نہیں رکھا گیا۔

پاکستان آکر ملازمت کے ابتدائی چار پانچ سال حسن ابدال میں گذارے۔ وہاں ایسا دل لگا کہ چھوڑنے کا نام نہ لیتے۔ جو گھر مل گیا اسکو نہ چھوڑا۔ حسن ابدال میں عزاداری کی ابتدا کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ وہاں امام باڑہ قائم کیا اسکی تعمیر وترقی کے لئے جو کچھ ممکن تھا کیا۔ غرضیکہ وہ حسن ابدال۔ جہاں ایک دن کی عزاداری مشکل

تھی اب چہلم تک دھڑتے سے ماتم ہوتا ہے ۔ اور ہر سال آندھی آئے یا پانی آغا بھائی جان جہاں بھی ہوں حسن ابدال کے محرم کی شان بڑھانے ضرور آتے ہیں۔ ایک سال بہت بیمار تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اب کی بار انکا حسن ابدال آنا مشکل ہے بگر محرم کی دو تاریخ آئی اور آغا صاحب اسی بیماری کے عالم میں آئے۔ امام بارہ میں اُن کی گرجدار آواز سنائی دی۔

ان کو اپنی زبان پر بہت ناز ہے۔ مادری زبان لکھنوی ہے۔ بقول خود ان کے کوثر کی دھلی ہوئی زبان۔ بڑے بڑے شاعروں اور استادوں کو اپنے سامنے کچھ نہیں گردانتے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اگر کوئی لغت کا حوالہ دیکر بات کرتا ہے تو جواب دیتے ہیں کہ 'لغت ہماری تابع ہے۔ ہم لغت کے تابع نہیں۔ لغت ہم سے بنی ہے۔ ہم لغت سے نہیں بنے۔ ہم لغت ناطق۔ اردو ہمارے گھر کی کنیز ہے۔ ایک بار ایم اے کے امتحان میں کسی عظیم ترین شاعر پر مضمون لکھنے کو آیا۔ آپ نے بجائے اس کے کلام کی خوبیاں لکھنے کے اسکی تمام شاعرانہ خامیاں اور غلطیاں گنوا کر رکھ دی۔

بلا کے خود دار ہیں۔ کسی کے سامنے اپنی پریشانیوں کا ذکر نہیں کرتے۔ بچپن سے ہی خودداری کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ حضور امی کہتی تھی کہ جب وہ صرف دو ڈھائی سال کے تھے لکھنو میں ماموں جان کے گھر گئے۔ دستر خوان پر بالائی کے پیالہ

آئے۔ ماموں جان نے پیالہ ہاتھ میں لیکر پوچھا آغا بالائی کھاؤگے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ ماموں جان نے بجائے انہیں دینے کے بالائی کا چمچہ اپنے منہ میں رکھ لیا۔ دوبارہ پوچھا آغا بالائی کھاؤگے۔ جواب میں پھر ہاں ہوئی۔ ماموں جان نے وہ چمچہ بھی منہ میں رکھ لیا۔ دوبارہ پوچھا پیالہ خالی ہوگیا — اور ماموں جان نے تنبیہ کیلئے بالائی ان کو نہ دی۔ اس کے بعد ماموں جان نے لاکھ کوشش کی آغا نے بالائی نہ کھائی۔ آج بھی "آغا بالائی کھاؤگے" کا فقرہ ہمارے گھر کا ایک محاورہ ہے۔ بڑی مشکلات کا سامنا کرنے پر بھی کسی کا احسان نہیں لیا۔ دوسروں کے لئے بہت کچھ کیا مگر اپنے لئے کچھ نہ رکھا۔

شاعری کا شوق بھی بچپن سے ہوا طبیعت ہمیشہ سے موزوں تھی۔ نویں کلاس سے باقاعدہ نظمیں لکھنے لگے اور اس پایہ کی نظمیں لکھیں کہ وقت کے مشہور رسالوں میں چھپنے لگیں۔ مثلاً "آج کل" دہلی اور افکار بھوپال میں برابر جگہ ملی۔

مشاعروں میں شرکت کی تو حاصلِ مشاعرہ ان کی ہی نظمیں ہوتیں اکثر انعامی مقابلوں میں اوّل انعام بھی حاصل کیا۔ ان کی اس دور کی نظموں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک نویں کلاس کا طالب علم ایسی نظمیں لکھ سکتا ہے جو آج کل بی۔اے کا طالب علم صحیح طریقے پڑھ بھی نہیں سکتا۔ ان کی نظموں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کچھ دُور پہ مشرق میں کرن پھوٹ رہی ہے
اور رات کی دیوی کے گہر لوٹ رہے ہے
لیلیٰ کی بھی افشانِ جبیں چھوٹ رہی ہے
اُلجھے ہوئے تاروں کی لڑی ٹوٹ رہی ہے
آتا ہے نظر دور پر آکاش گلابی
فطرت نے ہے گویا کوئی بارات نکالی

اے کھنڈرات عہد رفتہ کی شکستہ یادگار
رہ گیا تو صفحۂ ہستی پر مثل سوگوار
یہ تری ٹوٹی منڈیریں یہ پھٹے دیوار و در
مثل بیگانہ کھڑے ہیں اب بساط خاک پر

پاکستان کی تحریک کی حمایت میں پُرجوش سیاسی نظمیں بھی اسی زمانے میں لکھیں مجلسوں کے نوحے لکھے۔ جو تمام شہر میں زبانِ زدِ عام و خاص تھے ـــ چونکہ وہ زمانہ ان کی طالب علمی کا تھا اور عمر بھی بہت کم تھی اندیشہ تھا کہ اس چسکہ میں پڑکر تعلیم سے لاپرواہی نہ کریں ـــ سو بڑے بھائی کے منع کرنے پر شاعری موقوف کر دی لیکن ذہن کی طباعی اور جولانیاں باقی تھیں۔ جو مختلف رنگوں میں ڈھل رہی تھیں۔ تعلیم ختم کر کے پاکستان آ گئے۔ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ

نے ان کے سوئے ہوئے جذبے کو پھر جگا دیا اور انہوں نے کئی ولولہ انگیز نظمیں اور قطعہ کہیے۔ خطابت کا زور مجلس عزا سے شروع ہو چکا تھا، مگر ان دنوں اس کیلیئے خاص میدان تھا چنانچہ بہاولپور میں بے شمار پرجوش تقریریں کیں، جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئیں اور گورنمنٹ آف پاکستان نے اس کا اعتراف بھی کیا۔ آہستہ آہستہ ان کی اُدبی و تخلیقی قوتوں کو پھر راہ ملی۔ ذہن نے نئی کروٹ لی۔ مرثیہ کی طرف رجحان ہوا۔ اور پہلا مرثیہ والدہ مرحومہ کی برسی پر کہہ کر پڑھا مرثیہ کیا قوت گویائی کا بہتا ہوا دریا تھا، مجمع پر چھا گئے واہ واہ کی دھوم سے محفل گونج اٹھی۔ آج معلوم ہوا کہ ان کو قدرت نے مرثیہ گوئی کیلیے پیدا کیا ہے۔ امام کی محبت اور شاعری کا میلان مرثیہ نگاری کے رنگ میں خوب چمکا۔ ایک کے بعد ایک۔ پانچ مرثیے کہے اور پانچوں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مراثی کی مقبولیت صرف بہاولپور، حسن ابدال واہ اور راولپنڈی تک ہی محدود نہیں رہی۔ کراچی کی عظیم مجالس میں بھی اسکو واہ داد ملی کہ شاید ہی کسی نووارد مرثیہ گو کو ملتی۔ بڑے بڑے شعرا نقاد اور مرثیہ گو حضرات ان کے جوہر کلام اور فنِ شاعری کا لوہا مان گئے۔

آغا سید سکندر مہدی رائے بریلی (یوپی) میں پیدا ہوئے ایف، اے شیعہ کالج لکھنؤ سے کیا۔ بی۔ اے لکھنؤ یونیورسٹی سے اور بی۔ ٹی کی ڈگری علیگڑھ یونیورسٹی سے

لیکر پاکستان آ گئے۔ ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے کر کے ملازمت
کی اور اب سکونت بہاولپور میں ہے۔ زندگی کی ہر دوڑ میں حیات
کی ہر منزل میں سردار رہے۔ حالات کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا
بے حد سعادتمند بیٹے۔ بہت تابعدار بھائی انتہائی شفیق
باپ اور بہت مخلص دوست ہیں۔ جہاں رہے کامیاب رہے۔

گلشن میں سرو، فوج میں مثل نشان رہے
عالم میں سر بلند رہے ہم جہاں رہے

از

پروفیسر سیدہ حشمت جہاں ناز

گورنمنٹ کالج فار وومن۔ ایبٹ آباد

۱۴ اگست ۱۹۶۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جو ملا مجھ کو وہ توفیقِ الٰہی سے ملا

معراج کی بابرکت رات کو میں نے ایک محفلِ مقاصدہ میں سوداؔ کے زمین میں ایک قصیدہ پڑھا۔ جس کا مطلع ہے۔

حمد اللہ کی کرتا ہوں میں اوّل اوّل

ایک طرف ممدوحِ ذاتِ واجب کی ثنا خوانی، دوسری طرف شدتِ جوشِ ایمانی، قصیدہ بڑی شان سے اُبھرا ہر طرف سے داد و تحسین کا شور اٹھا اور آخر کار جانِ محفلِ مقاصدہ قرار پایا پکچھ مخلصوں نے سوداؔ اور محسنؔ سے تقابل کرنا چاہا مگر میں بصد عجز و نیاز اس سے گریز کر گیا۔ نقش اوّل اوّل ہے، نقش ثانی ثانی۔ ہاں میں نے ایک جزو کا اضافہ اجزائے قصیدہ میں کیا جس کا فخر ہے اور وہ ہے سراپائے شب۔

محفلِ مقاصدہ کے بعد میرے محترم دوست جناب سید انصار حسین نفیسؔ فتح پوری نے بڑے مشفقانہ انداز میں ارشاد فرمایا۔ "آغا صاحب اس قصیدے کے پسِ پردہ مرثیہ بول رہا ہے"۔ اب آپ ایک مرثیہ بھی کہیئے"۔ میرے ایک اور محترم دوست جناب رمضان علی وزیر نے بھی فرمائش کی اور وعدہ لیا کہ وہ مرثیہ ان کے یہاں پڑھا جائے گا۔ میں نے

بڑے اعتماد کے ساتھ مرثیہ کہنے اور پڑھنے کا وعدہ کرلیا اور اس وقت قطعاً یہ خیال نہ آیا کہ مرثیہ کہنا لانا ہے جوئے شیر کا۔ اسی اثنا میں صاحب محفل مقاصدہ برادرم سید مسعود حسن شہاب دہلوی بھی تشریف لے آئے اور ان سے مرثیہ کہنے کی میں نے پیش کش کی اور اہتمام مجلس کی ذمہ داری بھی لے لی۔ طے ہوا کہ اٹھارہ رمضان کی شب کو شہاب صاحب میرے غریب خانے پر مرثیہ شہادت بریوم ضربت پڑھیں گے اور ۲۱ رمضان کو میں سیٹھ رمضان علی وزیر کے دولت کدہ پر پڑھونگا۔

یہاں یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ سرزمین بہاولپور میں مرثیہ نگاری کی فضا سازگار ہوچکی تھی اور کم و بیش ایک سال کے عرصے میں جناب قائم رضا نسیم امروہوی، جناب فیض بھرت پوری جناب جوش ملیح آبادی اور سید آل رضا کے مراثی ادبی فضا پر چھا چکے تھے اور بہاولپور کے ادبی حلقوں میں نہ صرف اس کا چرچا تھا بلکہ اس صنف سخن کو اپنانے کا جذبہ بھی کار فرما تھا محترم شہاب دہلوی صاحب، اہلِ زبان اور صاحب فن ہیں، دل میں ولائے محمدؐ و آل محمدؐ کا نور ہے، اس لئے اللہ نے بہاولپور میں سب سے پہلے مرثیہ کہنے کا شرف انہیں کو عطا کیا۔

۱۷ رمضان کی رات میں موصوف نے اپنا معرکۃ الآرا مرثیہ غریب خانے پر پڑھا، جس کی یہ بیت آج بھی کانوں میں رس

گھول رہی ہے ؎

آیا لبوں پہ جب مرے مشکل کشا کا نام
قلعے تفکرات کے سر ہو گئے تمام

ادھر اس مرثیے کے دو دن بعد مجھے بھی ۲۱ ر رمضان کو مرثیہ نو تصنیف پڑھنا تھا، مرثیہ مکمل ہو چکا تھا۔ اور مولا کے کرم سے اپنے تمام اجزائے ترکیبی کے ساتھ زبان اور بیاں سے ذکر علیؑ ابن علی طالب کا مخلصانہ ہدیہ تھا۔ چونکہ میرے پیش نظر انیس و دبیر کے شاہکار تھے، اس لئے میں نے اس گلزار فکر و سخن سے ہٹ کر ایک الگ راستہ اختیار کیا اور روائتی اجزائے ترکیبی یعنی۔ چہرہ، سراپا، آمد، رجز، جنگ، شہادت اور بین کو ان کی قلمرو پاتے ہوئے اپنی راہ الگ متعین کی۔ اجزائے ترکیبی میں توحید، عدل، نبوت، امامت اور شہادت کو پیش نظر رکھا اور خدا نے کامیابی عطا کی۔

۲۱ ر رمضان کو مرثیہ پڑھا، اور امید سے زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی۔ اور حسب معمول جب محرم کرنے حسن ابدال گیا تو اس مرثیے کے لئے منظور صاحب اور اختر صاحب نے بڑا اہتمام کیا۔ واہ، راولپنڈی، حسن ابدال، کے مومنوں اور محبانِ محمدؐ و آل محمدؐ کو خصوصی دعوت دی گئی۔

نویں محرم کو شام ڈھلے جب مرثیہ پڑھا گیا تو۔ جہاں

ابتدا میں داد وتحسین سے امام باڑے کا ہال گونج رہا تھا۔ وہیں اختتام پر در و دیوار سے آہ و بکا کا شور ٹکرا رہا تھا۔ کیونکہ میں نے یہاں پر اس مرثیے میں شہادت علی ابن علی کے ساتھ ہی شامِ غریباں کی طرف گریز کر دیا تھا۔

مجلس کے اختتام پر راولپنڈی میں جناب یونس نقوی صاحب کے یہاں تیجے کی مجلس پر اس مرثیے کی فرمائش ہوئی جس کی تعمیل کر کے میں اور بھی سرخرو ہوا۔ اور اسی مجلس میں محترم جعفری صاحب پروفیسر کیڈٹ کالج حسن ابدال نے اگلے سال ایک اور مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی، برادر عزیز علی اختر زیدی پروفیسر صاحب نے نہ صرف اس بات کی تائید کی بلکہ ایک کے بجائے دو کی فرمائش کر دی۔

میرے لئے اس سے زیادہ خوش قسمتی کیا ہو سکتی تھی کہ میں ایسے کام میں سال بھر مشغول رہوں کہ جس سے جہاں ایک طرف احباب کے حکم تعمیل کروں وہیں دوسری طرف فکر عقبیٰ بھی ہوتی جائے۔ واپس بہاولپور آیا اور ایک مرثیہ جناب سید الشہدا کی شان میں لکھا۔

اسی اثنا میں مجھے کراچی جانا پڑا۔ بھائی جان سید حیدر مہدی رضوی کو مرثیہ نگاری کی اطلاع ہمشیرہ عزیزہ سیدہ حشمت جہان بیگم پروفیسر گورنمنٹ وومن کالج ایبٹ آباد، دے چکی تھیں۔ اشرف

منزل سادات کالونی میں مجلس کا اہتمام جناب سید کاظم عسکری صاحب و ڈاکٹر سید اکرام حسین نے کیا۔ کراچی کے اکثر و بیشتر مداحانِ محمدؐ و آلِ محمدؐ تشریف فرما تھے عالی جناب قبلہ نسیم امروہوی بھی حوصلہ افزائی کے لئے آئے تھے۔

مرثیہ پڑھا اور عزتِ دنیا و دیں سے سرفراز ہوا۔ کچھ مرثیے کا الوکھا رنگ اور کچھ اہلِ کراچی کا جذبۂ عقیدت، مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر دو امام باڑوں میں مرثیہ پڑھنے کی اور دعوت دی گئی۔ ایک میں جناب بھائی بادشاہ مرزا کا اہتمام تھا اور دوسرے میں برادرم ابوالحسن جعفری صاحب کا۔

خدا سلامت رکھے بھائی جان سید جیدٗ مہدی رضوی کو کہ جنہوں نے میری حوصلہ افزائی اس قدر کی کہ مَیں نے اسی سال دو مرثیہ اور کہے ایک جناب عباسؑ کے حال کا جو اس سال جامعہ امامیہ کراچی میں اور امام بارگاہ پاکستان کوارٹرز کراچی میں پڑھا گیا اور دوسرا شہزادہ علی اکبر کے حال میں جو بہاولپور میں پروفیسر ڈاکٹر اسد اریب۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے دولت کدے پر پیش کیا گیا۔ پانچواں مرثیہ جناب حُرؑ کے نام کا ابتدائی مراحل سے گذر کر نقطۂ عروج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ توفیق الٰہی شامل حال رہی تو انشاءاللہ آئندہ محرم میں حسب فرمائش جناب منظور و اختر صاحبان، پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا

۱۱؍ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو پانچواں مرثیہ جناب "حُر" کے حال کا بھی مکمل ہوگیا۔ محترم دوست سید مظفر حسینؑ زیدی نے مجلس کا اہتمام کیا۔ اس مرثیہ پر بہاولپور کے ارباب فن نے جتنی حوصلہ افزائی کی ہے میں ان کا ممنون ہوں۔ خاص طور پر حلقۂ حیدری بہاولپور کے احبا کا، جن کے مرکز و محور محترم حبیب بھائی ہیں جو خود بھی شاعر ہیں اور شاعر نواز بھی۔ اس کے علاوہ جناب رشید قریشی صاحب جناب اسد رضا گردیزی، سید اسلام حسینؑ زیدی۔ جناب میکش لکھنوی ایس۔ ایم نقوی امروہوی۔ جناب سید محمد عابدی۔ جناب حکیم احمد حسن لکھنوی اور سید عباس نظیر صاحب بھی میرے شکرے کے مستحق ہیں کہ جنہوں نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا، بات مکمل نہ ہوگی۔ اگر میں عبدالحمید ارشد صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں جنکی سُخن فہمی اور سُخن سنجی اکثر و بیشتر میری جولانیٔ طبع کا باعث ہوئی۔

مرثیوں کی ترتیب وہی ہے جس ترتیب سے انہیں کہا گیا۔ تبصرہ کرنے والے حضرات وقت کے مانے ہوئے ادیب اور عالم ہیں۔ جو مجھ سے اچھی طرح سے واقف ہیں، انہیں نے خود میرے مرثیے سُنے ہیں اور اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے مرثیوں کا تجزیہ کیا ہے کسی نے اجزائے ترکیبی کے بدلنے کو سراہا ہے اور کسی نے حیرت و استعجاب کا اظہار کیا ہے۔ بہرحال خوشی اس بات کی ہے کہ ہر فرد نے پُرخلوص انداز سے میری کاوشوں کا جائزہ لیا ہے۔ میں ان سب کا ممنون ہوں۔

اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اُس نے مجھے مرثیہ نگاری کے شرف سے نوازا اور مرثیہ کہنے سے پہلے اس کی کاوش اور کامیابی کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا۔ یقین جانئے کہ ہر مرثیے لکھنے سے پہلے یقین نہیں آتا تھا کہ مرثیہ بخیر و خوبی انجام پذیر ہوگا، مگر جب سلسلہ شروع ہوا تو مصرعوں پر مصرعے اور بند پر بند خود بخود صفحۂ قرطاس پر ثبت ہوتے چلے گئے۔ ذکر مولا کا تھا اور تائید آسمانی کہ مجھے عزّت و عظمت کے راستے خود بخود ملتے چلے گئے۔

آخر میں ایک بات اور عرض کردوں کہ پہلے دو مرثیوں میں مرثیے کی ایک اہم روایت سے میں غیر شعوری طور الگ ہوگیا ہوں اور وہ ہیں غیر مردف بیتیں۔ میرے محترم قبلہ نسیمؔ امروہوی نے اس روایت کے برتنے اور برقرار رکھنے کا حکم دیا۔ میں نے آئندہ کے مرثیوں میں اس بات کو پیش نظر رکھا ہے۔ پہلے دو مرثیوں کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

آغا سکندر مہدی

کربلا روڈ۔ بہاولپور

یکم اپریل ۱۹۶۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"مرثیہ نور کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے" (آغا)

بہاولپور میں کوئی ادبی اجتماع ہو یا ثقافتی ـ سماجی امور ہوں یا سرکاری تقاریب، جب تک ایک جانی پہچانی شخصیت اس میں موجود نہ ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی کمی ہے۔ بانیانِ محفل ہوں یا شرکاء، سب کے ہی لئے اِن میں ایک مقناطیسیت کار فرما ہے۔ ان کی تشریف آوری میں ذرا دیر ہوئی۔ اور متجسس نگاہیں اُن کو ڈھونڈھنے لگیں۔ مشاعرے کی محفلیں ہوں، سماجی یا ثقافتی اجتماعات آپ اکثر دیکھیں گے کہ یہ صاحب کبھی اسٹیج کنڈکٹ کر رہے ہیں۔ تو کبھی اہم انتظامی امور میں منہمک پاک، بھارت جنگ کے دوران کبھی کمشنر کے ہمراہ دورے پہ ہنگامی ضروریات پر تقریر کر رہے ہیں۔ کبھی عمائدین شہر کی میٹنگ میں شامل کبھی بپھرے ہوئے طلباء کے مطالبات کے سلسلے میں بحسن وخوبی معاملات سُلجھا اور سُلجھا رہے ہیں۔

غرضیکہ آغا سکندر مہدی صاحب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ نہایت خوش اخلاق۔ شیریں سخن۔ حفظ مراتب کے اصول زریں پر عمل پیرا ہر طبقہ خیال میں مقبول ومحبوب ہیں۔ یہ نہ ہوں۔ تو محفل سونی سب کا دِل اچاٹ یہ آئے کہ ماحول میں زندگی کی

لہر دوڑ گئی۔ غرض کہ عجب باغ و بہار ہستی ہیں مشاعروں میں اکثر شعرا کی فہرست ان کے پاس، مگر کیا مجال کہ کبھی تقدیم و تاخیر کے سلسلے میں کوئی کبیدہ خاطر ہوا ہو۔

مجھے اس موقعے پر آغا سکندر مہدی صاحب کے ذاتی محاسن بیان کرنا مقصود نہیں۔ یہ تو بطور تعارف چند الفاظ سپرد قلم کر دیئے آغا صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اور تقریباً ہر صنف سخن میں طالب علمی کے زمانے سے طبع آزمائی کرتے آئے ہیں۔ یہاں صرف اُن کی مرثیہ گوئی کا ذکر منظور ہے۔ جس حُسن اتفاق نے مجھے یہ چند سطور لکھنے پر راغب کیا صرف اُسی کا ذکر کر رہا ہوں۔

اکتوبر ۱۹۶۷ء کا ذکر ہے۔ کہ حضرت شہابؔ دہلوی کے دولتکدے پر ایک طرحی نعتیہ مقاصدے کی محفل منعقد ہوئی۔ اس مقدس محفل میں شہابؔ صاحب کے جملہ احباب خاصان شہر اور شعرائے کرام شریک تھے رئیس الجامعہ اسلامیہ جناب بلگرامی صاحب بالقابہ بھی جو علم و فضل میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں جلوہ افروز تھے۔ نہایت خوشگوار اور پاکیزہ ماحول تھا۔ شعرائے کرام بارگاہِ رسالتؐ میں اپنا خزینۂ عقیدت نذر کر رہے تھے۔ قصیدے ایک سے ایک ہوئے۔ کیوں نہ ہو۔ حضرت شہابؔ دہلوی جیسے اہلِ زبان اور کہنہ مشق شاعر شیریں مقال کا دولتکدہ اور ممدوح وہ کہ بعد خُدا لاثانی ہیں نے بھی قصیدہ کہنے کی سعادت حاصل کی تھی۔ حضرت تابشؔ الوری اور

جناب شہاب دہلوی و نشتر لکھنوی نے بھی گُل افشانی کی۔ مجید تمنا صاحب بھی گُہرہائے آبدار نچھاور کر گئے۔ مگر قصیدہ جو آغا صاحب نے پیش فرمایا۔ وہ حاصل مقاصدہ رہا۔ سامعین پر کیف و سرور نے ایک سماں باندھ دیا۔ جس وقت شہاب صاحب حاضرینِ محفل کو شیرنی اور چائے سے نواز رہے تھے۔ میں نے آغا صاحب سے کہا۔ کہ "آغا صاحب آپ مرثیہ کہیئے۔ مرثیہ تو آپ ہی چھلک رہا ہے"۔ مَیں نے یہ بے ساختہ و برجستہ جملہ اِس لئے کہا۔ کہ جس زمین میں آغا صاحب نے قصیدہ کہا اوّل تو یہ اساتذہ متقدمین کی پامال زمین اور دوسرے یہ کہ جس ذاتِ گرامی کے واسطے کہا گیا۔ اُس کی شان ایسی کہ "با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار" زمین یہ کہ "تیغ اردی نے کیا۔ باغ خزاں مستاصل حضرت سوداؔ مرحوم تو اِس زمین کو آسمان بنا ہی گئے تھے۔ اور کچھ حضرت محسنؔ کاکوروی سی زمین میں تردد کر کے بام شہرت پر جا پہنچے۔ اب اس زمین میں نئی راہیں نکالنا۔ اور تسخیر ماہ تاباں کرنا انہیں آغا صاحب کا کام تھا۔ بات چونکہ مرثیے کی ہے۔ اس قصیدے کے واسطے کچھ مزید لکھنا ضروری نہیں۔ جو حضرات اس کا مطالعہ کر چکے ہیں یا کریں گے۔ وہ اِس سے زیادہ قابلِ تعریف پائیں گے۔

میرا کہنا کچھ ایسا کارگر ہوا۔ کہ جیسے آغا صاحب اسی کے منتظر رہے ہوں۔ ایک دبی ہوئی آرزو اور دیرینہ تمنا بر آئی۔ آپ نے مرثیہ بعجلت کہا۔ اور خوب کہا۔ زمانہ ماہ رمضان المبارک کا تھا۔ موضوع

رہا۔ شہادت امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ذرا سوچئے کہ اس صنفِ سخن میں کیسے کیسے خدایانِ سخن حضرت میر انیس و مرزا دبیر جیسے گذر چکے ہیں اور دورِ حاضر میں حضرت جوش ملیح آبادی سید آل رضا اور جناب نسیم امروہوی بفضلہٖ مثل "بلبل باغ رسول" چہک رہے ہیں۔ ہما وشما کا کیا حوصلہ کہ مرثیہ کہیں اور وہ مرثیہ کہ جس کو مقبولیت عام کا درجہ حاصل ہو جائے اور مرثیہ بھی ایسے موضوع پر جس پر لوگوں نے مقابلتاً کم کہا ہے۔

واقعہ جانگداز کربلا ایک۔ واقعات وہی۔ کردار وہی۔ اب بتایئے کہ ہر کہنے والا کہاں تک توارد و مماثلت سے بچے اور اُن ہی واقعات کے نظم کرنے میں کیا نیا انداز بیاں لائے۔ اور اسلوب و آہنگ کون سا وضع کرے اور مرثیہ زیر بحث تو مولا علیؑ کی شہادت سے متعلق ہے۔ اس میں کثرت واقعات ہیں۔ روانگی ہے نہ سفر اعوان و انصار ہیں نہ فوج اشرار۔ سوال و جواب بیعت نہ پانی کی قلت گھوڑا ہے نہ تلوار۔ رجز خوانی ہے نہ پیکار۔ لوازمات مرثیہ کا دامن کیسے ہاتھ میں رہے۔ بہرحال آغا صاحب نے اس دشوار گذار راہ کو بڑی مستعدی اور چابکدستی سے طے کیا۔ بہاولپور ہی نہیں۔ مرثیہ کراچی میں پڑھا اور خراج دادِ تحسین حاصل کیا۔ پنڈی جسن ابدال اور کینٹ کے باذوق سامعین سے بھی تحسین و آفرین کے نعرے سُنے۔

الغرض آغا صاحب بہاولپور اور اس کے اطراف و جوانب

ہیں اردو ادب کی خدمت بطریقِ احسن انجام دے رہے ہیں۔ ان کے اس اقدامِ مستحسن پر حضرت سید اعزاز حسین نشتر اور جناب سید مسعود حسن شہاب دہلوی نے مرثیے لکھے۔ مرثیے لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ آغا صاحب کا ادبی اور ثقافتی خلوص اور انہماک رنگ لایا۔ اور ادبی حلقوں کی تخلیقی سرگرمیوں کے واسطے ایک نیا راستہ ہموار کیا۔ بہاولپور اگرچہ ایک چھوٹا سا شہر ہے مگر یہاں کے ادبأ و شعرأ اور صحافی زبان اُردُو کی ترویج و ترقی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ اگر کمی تھی۔ تو مرثیہ گوئی کے میدان میں اور الحمدُللہ کہ اب یہ کمی باقی نہ رہی۔ اب ایک آغا صاحب ہی اکیلے مرثیہ گو نہیں۔ حضرت شہاب اور جناب نشتر بھی اس مشکل جادہ سخن پر گامزن ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اہلِ بہاولپور اپنے سے کئی گنا بڑے شہروں سے ادبی سرگرمیوں میں کسی طرح کم نہیں بات کہاں سے کہاں پہونچی۔ مگر ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ خیر!

حضرت آغا لکھنوی نے جو مرثیہ کہا ہے۔ اس پر نقد و تبصرہ مقصود نہیں۔ یہ تو اہلِ علم حضرت و قارئین با ذوق خود ہی ملاحظہ فرمائیں گے۔ کہ اس نقشِ اول کو آغا صاحب نے کس خوش اسلوبی سے جریدہ ادب اردو پر ثبت فرمایا ہے۔ میں تو اس مرثیے کو سُن کر ہر بار یہی کہہ اُٹھتا ہوں کہ " اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

مرثیہ زیرِ نظر میں یوں تو مطلع سے مقطع تک ہر بند لائقِ توصیف و تعریف ہے۔ زبان و بیان کی لذت محسوس اور واقعہ نگاری کے

کے اثرات کاری ہیں۔

فرماتے ہیں :۔

"ذات واحد کا کروں تذکرۂ حسن و جمال
میں ہوں ایک بندہ مجبور کہاں میری مجال
وہ تو ہے ذات احد خالق بے مثل و مثال
لامکاں فکر میں آجائے تصور ہے محال

بیت سنیئے :۔

پھر بھی جس سمت مری طبع رسا جاتی ہے
حسن خلاقِ دو عالم کی جھلک پاتی ہے

حمد کی منزل سے آگے بڑھتے ہیں۔ تو انوار محمدی سے چشم تصور میں عجب روح پرور منظر دیکھتے ہیں :۔

طائرِ عقل رسا اوجِ ہما پاتا ہے
مثل براق فضاؤں میں اُڑا جاتا ہے
آئینہ مانیؔ و بہزادؔ کو دکھلاتا ہے
مرثیہ نور کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے
فکر توحید سے افکار میں یکتائی ہے
شاعری ذکر محمد سے نکھر آئی ہے

غرضیکہ اس حسیں نکھار کے مختلف مناظر طے کرتے ہوئے اب واقعہ نگاری کی منزل پر فرماتے ہیں :۔

اذن جب آپ کو تبلیغ رسالت کا ملا
نوعِ انسان کو ضلالت نے دبا رکھا تھا

کفر و الحاد کا چرچا تھا مکدر تھی فضا
ایسے ماحول میں اعلانِ نبوت کا کیا
حق کا اعلان کیا، حق کی اعانت چاہی
اس کی تائید محمدؐ نے علی سے پائی

دیکھئے مرثیئے کا زور بتدریج بڑھ رہا ہے۔ واقعات کا بیان جاری ہے۔ اعلان نبوت میں تائید علی کے بعد کے مراحل ہیں۔ اور اب بہ

کار تبلیغ رسالت میں علیؑ ساتھ رہے
شب ہجرت کی عبادت میں علیؑ ساتھ رہے
بدر و خندق کی شجاعت میں علیؑ ساتھ رہے
فتح خیبر کی بشارت میں علیؑ ساتھ رہے
اُٹھ گیا خانہ کعبہ سے بتوں کا سایہ
مرتبہ دوشِ محمد پہ علیؑ نے پایا

اس مرتبہ جلیل پر علی پہنچے۔ اور اب وہ وقت ہے۔ نور رسالت دنیا کی نگاہ ظاہر بیں سے پوشیدہ ہو چکا ہے اور علی کو منصب خلافت بہ اہلِ دُنیا نے بہ جبر لا بٹھایا ہے، عدل و انصاف کا اقتضا ہے۔ کہ

جس کسی نے بھی تھے احکام پیمبر بدلے
اُن کو موقوف کیا سارے وہ افسر بدلے
برطرف کر دیئے حکام، گورنر بدلے
سلطنت پاک کی چن چن کے ستمگر بدلے

حق کے اعلان سے تنظیم ریاست بدلی
کھلبلی مچ گئی باطل کی سیاست بدلی

اس کا اثر ملاحظہ فرمایئے لکھتے ہیں ؎

قتل مولا پہ ہوئے سارے مخالف تیار
نہ رہیں حق کی حفاظت کو امام ابرار
ابن ملجم کو بنایا گیا اک آلۂ کار
وہ چلا زہر ہلاہل میں بجھا کر تلوار
ظلم ظالم نے بڑا بغض و عداوت میں کیا
وار تلوار کا محراب عبادت میں کیا

اب قلم بحر غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ بیت لکھتے ہیں کہ:۔

خون ناحق جو بہا کون و مکاں کانپ گئے
ظلم ظالم نے کیا ہر دو جہاں کانپ گئے

مولائے کائنات کی شہادت سے کون تھا۔ جو دلفگار نہ ہوا۔

غم سے بے جان ہوئیں زینب و ام کلثوم
مثل تصویر ہیں حسنین بہ حال مغموم
یک بہ یک ٹوٹ پڑا کیسے مصائب کا ہجوم
قتل کے روز تھے روزے سے امام مظلوم
رو کے رکتا نہیں اک اشک کا دریا ہے رواں
بھوکے پیاسے گئے دنیا سے امام دو جہاں

الغرض مرثیہ مقطع پر بیت کے مصرعہ ثانی پر یوں ختم ہوتا ہے۔ کہ

نام آغا کا رہے۔ شبیہ کے عزاداروں میں

آخر میں میں خداوند قدوس سے دست بدعا ہوں کہ وہ جناب آغا سکندر مہدی صاحب کو عمر دراز عطا فرمائے۔ اور دنیائے ادب و شعر میں اعلیٰ مدارج پر متمکن فرمائے۔

"آمین ثم آمین"

خیر اندیش

نفیس فتح پوری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطلع

اسمِ اللہ سے آغازِ بیاں کرتا ہوں
کلمۂ پاک سے مقصد کو عیاں کرتا ہوں
حمد و تسبیح خداوندِ جہاں کرتا ہوں
سورۂ نور کو میں وردِ زباں کرتا ہوں

ذکرِ توحید عبادت ہے رقم ہوتا ہے
سرنگوں حمدِ الٰہی میں قلم ہوتا ہے

۲

لائقِ حمد و ثنا، ذاتِ خداوند جلیل

خالقِ ارض و سما، ذاتِ خداوند جلیل

منبعِ جود و سخا، ذاتِ خداوند جلیل

مرکزِ لطف و عطا، ذاتِ خداوند جلیل

لفظ بیکار ہیں، اندازِ بیاں قاصر ہے

اُس کی تعریف سے انساں کی زباں قاصر ہے

ذاتِ واحد کا کروں تذکرۂ حسن و جمال

میں ہوں اک بندۂ مجبور کہاں میری مجال

وہ تو ہے ذاتِ اَحد، خالقِ تمثیل و مثال

لامکاں فکر میں آجائے، تصور ہے محال

پھر بھی جس سمت مری طبعِ رسا جاتی ہے

حُسنِ تخلیق سے بھرپور فضا جاتی ہے

حکمِ معبود سے جب نورِ محمدؐ چمکا

کوئی موجود نہ تھا، خالقِ یکتا کے سوا

نہ زماں تھا، نہ مکاں تھا، نہ خلا تھا نہ فضا

اور تو اور ہے خود عالمِ امکاں بھی نہ تھا

آئینہ حسنِ حقیقی کا تھا، یکتائی تھی

ہر طرف نورِ محمدؐ کی ضیا چھائی تھی

۵

بعد میں سلسلۂ روز و شب تار بنا

نیلگوں رنگ لئے گنبدِ دوار بنا

مُنجمد نور ہوا، مطلعِ انوار بنا

چاند تاروں کو لئے چرخِ طرحدار بنا

کرۂ ارض پہ سورج کی کرن تھرائی

پرچمِ نور لئے صبحِ ازل لہرائی

وجہ تخلیق بنی نورِ محمدؐ کی ضیا
روشنی پھیل گئی، ہو گئی معمور فضا
حکمِ خالق سے ہوئے جن و ملائک پیدا
گلشنِ عالمِ امکاں کا ہر اک پھول کھلا
قلزمِ نور میں حضرت کا سفینہ آیا
انبیا بن گئے جب انکو پسینہ آیا

۷

طائرِ عقلِ رسا، اوجِ ہما پاتا ہے

مثلِ بُراق، فضاؤں میں اُڑا جاتا ہے

آئینہ مانیؔ و بہزادؔ کو دکھلاتا ہے

مرثیہ نور کے سانچے میں ڈھلا جاتا ہے

ذکرِ توحید سے افکار میں یکتائی ہے

شاعری حُسنِ محمدؐ سے نِکھر آئی ہے

منھ سے جو لفظ نکلتا ہے گہر ہوتا ہے

حُسن صورت میں مثالِ گُلِ تر ہوتا ہے

باغِ افکار کا پاکیزہ ثمر ہوتا ہے

اپنے دامن میں لئے نورِ سحر ہوتا ہے

میرے خالق نے مجھے درِ نجف بخشا ہے

مدحِ سرکارِ دوعالم کا شرف بخشا ہے

موجِ دریائے فصاحت ہے زباں سے جاری

قلزمِ فن ہے بلاغت کی مرصع کاری

فکر کے رنگ سے کرتا ہے قلم گلکاری

جذبۂ عشقِ محمدؐ ہے فضا پر طاری

عرش سے فرش پہ قدسی کی صدا آتی ہے

عاقبت ذکرِ محمدؐ سے سنور جاتی ہے

فکرِ انساں کی پابندِ زباں ہوتی ہے
شاعری آئینۂ جذبِ نہاں ہوتی ہے
کیفیت قلب کی لفظوں سے بیاں ہوتی ہے
حُسنِ ترتیب سے دنیا پہ عیاں ہوتی ہے

رازِ فطرت کا اگر ماہرِ فن ہے شاعر
حق تو یہ ہے کہ شہنشاہِ سخن ہے شاعر

۱۱

شاعری! حُسنِ خیالات کا ہے عکسِ جمیل

شاعری! ارض و سماوات کا ہے عکسِ جمیل

شاعری! رب کی عنایات کا ہے عکسِ جمیل

شاعری فن کی روایات کا ہے عکسِ جمیل

نقشِ دل کاوشِ پیہم سے اُبھر آتا ہے

جوہرِ عطرِ فضاؤں کا نِکھر آتا ہے

آسماں چیر کے جاتی ہے نگاہِ شاعر

بخت خوابیدہ جگاتی ہے نگاہِ شاعر

حدِّ آفاق پہ چھاتی ہے نگاہِ شاعر

حسنِ قدرت کو دکھاتی ہے نگاہِ شاعر

وسعتِ فکر سے ذرے کو بیاباں کر دے

حسنِ تدبیر سے کوزے میں سمندر بھر دے

مرثیہ باشدتِ جذبات کا آئینہ ہے
قوم کی رسم و روایات کا آئینہ ہے
ذاتِ باری کی مناجات کا آئینہ ہے
مردِ مومن کی عبادات کا آئینہ ہے
اشہبِ فکر سوئے عرشِ بریں جاتا ہے
رشک سے رنگ عطارد کا اڑا جاتا ہے

لوحِ محفوظ پہ جنبش میں قلم آتا ہے
جھلکیاں عرش سے تقدیر کی دکھلاتا ہے
فرش پر قصہ آدم کی خبر لاتا ہے
آتشِ بغض سے ابلیس جلا جاتا ہے

نورِ سرکارِ رسالت سے جو زک پائی ہے
ابنِ آدم کو ستانے کی قسم کھائی ہے

جب فرشتوں نے سرِ عرش یہ اعلان سُنا

نائبِ ربِ علاؔ ارض پہ انساں ہوا

یک زباں ہو کے یہ دربارِ الٰہی میں کہا

حمد و تسبیح میں مصروف ہیں ہم، صبح و مسا

تیری مرضی کے ہمیشہ سے طلبگار ہیں ہم

ایسے عہدے کے تو دُنیا میں سزاوار ہیں ہم

ہم کو چُھپنا تھا کہ ہیں عرش معظم کے مکیں

تا کہ ہوئی تری تسبیح سے معمور زمیں

آئی آواز "حقیقت تمہیں معلوم نہیں

روح جب اسمیں پُھنکے تم کو جھکانا ہے جبیں

گفتگو ختم ہوئی اور اجازت نہ ملی

اللہ اللہ فرشتوں کو خلافت نہ ملی

خاک سے پیکرِ آدم کو جو تیار کیا
سب گرے سجدے میں ابلیس نے انکار کیا
عظمتِ نورِ محمدؐ کا نہ اقرار کیا
اور تو اور تکبّر کا بھی اظہار کیا

کس بلندی سے فقط بغض و عداوت میں گرا
حد سے آگے جو بڑھا قعرِ مذلّت میں گرا

روزِ بدُ بُغضِ محمدؐ نے اسے دکھلایا
زعم میں اپنے گِرا، فرشِ زمیں پر آیا
شعلۂ بُغض بنا، چار طرف لہرایا
عظمتِ آدمِ خاکی، پہ بہت جھنجھلایا
تُل گیا وقعتِ انساں کو گھٹانے کے لئے
اُٹھ پڑا، نُورِ ہدایت کو بُجھانے کے لئے

باعثِ شرک بنا، فسق کے پھیلے سائے
گمرہی عام ہوئی، کفر کے بادل چھائے
مقتضی عدلِ الٰہی تھا کہ حجت جائے
نوعِ انساں کی ہدایت کو پیمبر آئے

خود پرستی کا جو ابلیسؑ نے سامان کیا
آدمؑ و نوحؑ نے توحید کا اعلان کیا

خضرؑ و الیاسؑ و ذکریاؑ و عزیرؑ و یحییٰؑ

یونسؑ و یوسفؑ و یعقوبؑ و شعیبؑ و موسیٰؑ

شیثؑ و ادریسؑ و سلیمانؑ و خلیلؑ و عیسیٰؑ

اپنے وقتوں میں تھے پیغامبرِ دینِ ھُدیٰ

پیکرِ خاک میں پھر نورِ ہدایت آئے

بعد میں حضرتِ سرتاجِ رسالت آئے

اے خوشا بخت کہ سرکار زمیں پر آئے

مرکزِ مطلعِ انوار زمیں پر آئے

سید و سرور، سردار زمیں پر آئے

عرش کے مالک و مختار زمیں پر آئے

آئینہ کوثر و تسنیم کو دِکھلاتی ہے

مئے توحید سے لبریز صبا آتی ہے

جس گھڑی عرش سے محبُوبِ الٰہی آئے

زورِ باطل کا گھٹا، حق کے علم لہرائے

تیرگی دور ہوئی، نُور کے جلوے چھائے

روشنی پھیل گئی، شمس و قمر شرمائے

فخر سے ارض کی گردن جو تنی جاتی ہے

اللہ اللہ کی گردوں سے صدا آتی ہے

دل نے چاہا کہ کروں شانِ محمدؐ کو رقم
فکرِ مجہول ہوئی، گر پڑا ہاتھوں سے قلم
کون کر سکتا ہے توصیف شہنشاہِ امم
قابَ قوسین کی منزل پہ گئے جسکے قدم
جس کو اللہ نے کونین کی شاہی دے دی
سنگریزوں نے نبوت کی گواہی دے دی

وصفِ سرکارِ دوعالم سے زباں قاصر ہے

مدحِ ممدوحِ الٰہی سے جہاں قاصر ہے

فکر پر زور نہیں، فکرِ رسا قاصر ہے

کیا بیاں کوئی کرے، زورِ بیاں قاصر ہے

فکرِ محدود کہاں، تذکرہ نور کہاں

ذاتِ مختار کہاں، بندہ مجبور کہاں

باعثِ عظمتِ انسان، حضورِ انور

وارثِ سورۂ عمران، حضورِ انور

رونقِ تختِ سلیمان، حضورِ انور

بخدا بولتا قرآن، حضورِ انور

ایک بھی لفظ بجز وحیِ الٰہی نہ کہا

منہ سے جو بات بھی نکلی ہوئی پیغامِ خدا

بخشا اللہ نے سرکار کو رُتبہ کیسا

دے دیا حکم تو ڈوبا ہوا سورج پلٹا

شب معراج تھا، وقت کا بہتا دھارا

ہو گیا ایک اشارے سے قمر دو پارا

مرتبہ بڑھتا تھا، پیغامِ خدا لاتے تھے

ان کے دربار میں جبریلِ امیں آتے تھے

اِذن جب آپ کو تبلیغِ رسالت کا ملا
نوعِ انساں کو ضلالت نے دبا رکھا تھا
کفر و الحاد کا چرچا تھا، مکدّر تھی فضا
ایسے ماحول میں اعلان نبوت کا کیا
حق کا اعلان کیا، حق کی اعانت چاہی
اس کی تائید محمدؐ نے علیؑ سے پائی

مومنو! ذکرِ علیؑ زیبِ قلم کرتا ہوں

بڑھ کے میں نادِ علیؑ سینے پہ دم کرتا ہوں

حق کا اعلان عبادت ہے، رقم کرتا ہوں

مدحِ ممدوحِ شہنشاہِ اُمم کرتا ہوں

ایسا مولود کہ کعبے میں ولادت پائی

ایسا مسعود کہ آغوشِ رسالت پائی

تاجِ خاتونِ جناں، نفسِ پیمبر ہیں علیؑ

بحرِ انوارِ الٰہی کے شناور ہیں علیؑ

دینِ اسلام کی شمشیر کا جوہر ہیں علیؑ

موجِ کوثر کی قسم، ساقیِ کوثر ہیں علیؑ

بات اژدر کی جو چھڑ جائے علیؑ حیدرؑ ہیں

جنگ کا نام جو آجائے علیؑ صفدر ہیں

کلِ ایمان علیؑ، صاحبِ قرآن علیؑ
وجہ ایقان علیؑ، منبعِ عرفان علیؑ
حق نگہبانِ علیؑ حق کے نگہبان علیؑ
اِک محمدؐ کے فقط تابعِ فرمانِ علیؑ
ساتھ سائے کی طرح گرد نبیؐ پروانہ
شمعِ توحید محمدؐ تو علیؑ پروانہ

لائق فخر و مُباہات علیؑ کا کردار

پاک قرآن کی آیات علیؑ کا کردار

مردِ مومن کی مُناجات علیؑ کا کردار

دینِ اسلام کا اثبات علیؑ کا کردار

حکم و احکامِ شریعت جو ادا کرتا ہے

اپنی مرضی اسے معبود عطا کرتا ہے

منبعِ عظمتِ اسرارِ نہاں علمِ علیؑ

باعثِ لذّتِ گفتارِ رواں علمِ علیؑ

مصدر و مرکزِ انوارِ جہاں علمِ علیؑ

مبدأ عظمتِ افکارِ جواں علمِ علیؑ

آپ کے باب میں سرکارِ دو عالم نے کہا

"شہر ہوں علم کا میں اور علی دروازہ"

کارِ تبلیغ رسالت میں علیؑ ساتھ رہے

شبِ ہجرت کی عبادت میں علیؑ ساتھ رہے

بدر و خندق کی شجاعت میں علیؑ ساتھ رہے

فتحِ خیبر کی بشارت میں علیؑ ساتھ رہے

اُٹھ گیا خانہ کعبہ سے بتوں کا سایہ

مرتبہ دوشِ محمدؐ پہ علیؑ نے پایا

جب چلی جنگ کے میداں میں علی کی تلوار

منتشر ہو گئیں اک دم میں صفوفِ کفار

نہ پیادہ نظر آتا تھا، نہ مرکب نہ سوار

ہر طرف حدِ نظر تک تھے سروں کے انبار

اہلِ لشکر نہ رہے، صاحبِ لشکر نہ رہے

ایسی تلوار چلی، مرحب و عنتر نہ رہے

ایسے آقا کہ غلامی پہ تھے قنبر نازاں

فخر سلمان کو تھا، مالکِ اشتر نازاں

میثم و یاسر و مقداد و ابا ذر نازاں

اور تو اور ہیں خود ذات پیمبر نازاں

خوش خدا ہو گیا، سائل نے انگوٹھی پائی

ان کی تعریف میں قرآن کی آیت آئی

مقصدِ زیست فقط مرضیِ مولا کا حصول

تھی عجب شانِ علیؑ پیشِ رسولِ مقبول

اللہ اللہ یہ رُتبہ کہ بنے نفسِ رسول

حکمِ خالق سے ملا مرتبۂ زوجِ بتول

سارے عالم کے شرف آلِ علیؑ نے پائے

اِن کے فرزند تو فرزندِ نبی کہلائے

جب بدلنے لگا دُنیا میں نبی کا پیغام
فتنہ و شر نے کیا دینِ مُبین کو بدنام
جلوہ افروز ہوئے تختِ محمدؐ پہ امام
تاکہ قائم رہیں دنیا میں اصُولِ اسلام
ہوش باطل کے اُڑے ہو گیا سکتہ طاری
کر دیئے آتے ہی احکامِ شریعت جاری

جس کسی نے بھی تھے احکامِ شریعت بدلے

ان کو موقوف کیا، سارے وہ افسر بدلے

برطرف کر دیئے حکام، گورنر بدلے

سلطنت پاک کی، چُن چُن کے ستمگر بدلے

حق کے اعلان سے تنظیمِ ریاست بدلی

کھلبلی مچ گئی، باطل کی سیاست بدلی

حق و انصاف پہ مبنی جو تھے احکام علیؑ
اہلِ اسلام کی ہر بات شریعت میں ڈھلی
دیں کا تابع ہوا، ہر فعل، خفی ہو کہ جلی
کِھل اُٹھی گلشنِ اسلام کی ہر ایک کلی
پرتوِ نور لئے حق کا علَم لہرایا
زورِ حق دیکھ کے باطل کو پسینہ آیا

عینِ قرآن کی تفسیر تھے احکامِ علیؑ

باعثِ عظمتِ اسلام تھے پیغامِ علیؑ

اہلِ باطل کے لئے قہر تھی صمصامِ علیؑ

تھے محبوں کے لئے سورۂ انعامِ علیؑ

حق کا آئین ملا، حق کے پرستاروں کو

جینا دو بھر ہوا، دُنیا کے طلبگاروں کو

حق و انصاف سے معمور رہا جبکہ جہاں

اہل باطل نے کیا سلسلہ شر کو رواں

خندق و بدر سے تھے بُغض علی دل میں نہاں

جو کہ صفین و جمل میں ہوئے دنیا پہ عیاں

سلسلے حق و صداقت کو مٹانے کے ہوئے

مشورے نورِ امامت کو بُجھانے کے ہوئے

قتلِ مولا پہ ہوئے سارے مخالف تیار

نہ رہیں حق کی حفاظت کو امامِ ابرار

ابنِ مُلجم کو بنایا گیا اک آلۂ کار

وہ چلا زہرِ ہلاہل میں بُجھا کر تلوار

ظلم ظالم نے بڑا بغض و عداوت میں کیا

وار تلوار کا محرابِ عبادت میں کیا

قبر میں گنبدِ خضرا کا مکیں تھرایا

ہفت افلاک ہلے عرش بریں تھرایا

اشک خوں بہنے لگے، قلب حزیں تھرایا

روشنی ختم ہوئی، مہر مبیں تھرایا

خونِ ناحق جو بہا، کون و مکاں کانپ گئے

ظلم ظالم نے کیا، ہر دو جہاں کانپ گئے

خون کا دریا ہوا پیشانیٔ حضرت سے رواں

زخم کاری لگا تھرائے امامِ دو جہاں

دل پہ قابو نہیں، کس طرح کروں غم کا بیاں

ضبطِ الفاظ میں آسکتا نہیں دردِ نہاں

فرش پر گر پڑے مسجد کے شہنشاہِ زمن

دل کو تھامے ہوئے روتے ہیں حسینؑ و حسنؑ

جبکہ مسجد سے چلے گھر کو امام معصوم

اشک خوں روتے تھے حسنینؑ بہ حال مغموم

ساتھ میں ہو لیا حضرت کے احبا کا ہجوم

بولے اس وقت حسنؑ سے یہ امام مظلوم

بس نہ آگے بڑھیں سب لوگ ٹھہر جائیں یہیں

وارثِ چادرِ زہراؑ نہ نکل آئیں کہیں

گھر میں پہنچے تو عجب حال اعزا کا ہوا

بیبیاں رونے لگیں، ہو گیا، کہرام بپا

دیکھ کے حال یہ زینب ہوئیں مصروف بکا

اُمِ کلثوم پُکاریں مرے بابا! بابا

درد بڑھتا گیا، باقی نہ رہی تابِ سُخن

ضُعف سے ہو گئے بے ہوش شہنشاہِ زمن

بعد کچھ وقفے کے جب ہوش میں آئے مولا

ابنِ ملجم کو احبا نے گرفتار کیا

جسم میں جان نہ تھی، رنگ تھا چہرے کا اڑا

حال دشمن کا جو دیکھا تو حسنؑ سے یہ کہا

حسنِ اخلاق زمانے کو دکھا دو بیٹا

جام شربت کا پیاسے کو پلا دو بیٹا

مُندمل ہو نہ سکا، زخم تھا بے حد کاری
ہو گیا چہرۂ اقدس سے پسینہ جاری
پوچھا پھر آپ نے ہر ایک کو باری باری
رفتہ رفتہ ہوئی حضرت پہ غشی سی طاری

نور پردے میں گیا، ہو گیا خورشید نہاں
سوئے فردوس گئی روحِ امامِ دو جہاں

غم سے بے جان ہوئیں زینب و اُمِ کلثومؑ
مثلِ تصویر تھے حسنینؑ بہ حالِ مغموم
یک بیک ٹوٹ پڑا کیسا مصائب کا ہجوم
قتل کے روز تھے روزے سے امامِ مظلوم
اشک تھمتے نہیں اک خون کا دریا ہے رواں
بھوکے پیاسے گئے دنیا سے امامِ دو جہاں

ماجرا شہ کی شہادت کا کروں کیسے رقم

سینہ شق ہو گیا چلتا نہیں کاغذ پہ قلم

اُٹھ گئے گلشنِ ہستی سے شہنشاہِ امم

سرِ افلاک فرشتوں میں بپا ہے ماتم

بُجھ گیا سلطنتِ علم و ہدایت کا کنول

آج رخصت ہوا دُنیا سے اِمامِ اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل"

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو جذبۂ ایمانی سے سرشار، یادِ الٰہی میں مصروف ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے باور پرباور کرکے جو کچھ آپؐ نے فرمایا اس پر ایسا یقین رکھتے ہیں۔ گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور اسی خیرِ کثیر سے وابستگی کی تمنا میں زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو پانے، حضور کی ذاتِ گرامی سے فیضیاب ہونے کا ذریعہ ان کی اتباع، ان کی محبّت ہے۔ محبّت میں آزمائشیں ہیں، صعوبتیں ہیں، تکلیفیں ہیں لیکن جو جس قدر اس محبّت میں کامیاب ہوا، اسی قدر اللہ کا محبوب بنا۔ خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تمام صعوبتیں بہ نفسِ نفیس اٹھانا پڑیں جو تمام انبیاء علیہم السلام کی وہ تمام مختلف زمانوں میں الگ الگ ذریعہ آزمائش بنی تھیں کہا جاسکتا ہے کہ انبیاء میں ایسے بھی ہیں جو شہید ہوئے۔ اس آزمائش کے لئے اپنے محبوب کے ساتھ کیا گیا۔ یہ امتحان کس طرح لیا گیا پھر اس کے اجر میں کیا دیا گیا۔

اہل علم سے یہ راز مخفی نہیں حضور سرور کائنات کی اس آزمائش کے لئے جگر گوشۂ رسول کے نورِعین کا انتخاب ہوا اور پھر یہ آزمائش اس انداز سے ہوئی کہ اس کو جس پہلو سے دیکھا جائے، یہ اپنی آپ مثال ہے۔

غم دل کی تفسیریں لکھی گئیں اور لکھی جائیں گی۔ لیکن شجر کلمہ طیبہ کو جن بزرگ ہستیوں نے اپنے خون سے ماسوا اللہ کے بے نیاز ہوکر سینچا تا قیامِ قیامت آسمانوں اور زمینوں پر ان کا ذکر ہوتا رہے گا اور ان عبدِ خدا نما ہستیوں کی توصیف کا وہ حق ادا نہ ہو سکے گا۔ جو انہوں نے کلمہ حق اور دعوت ایمان کا حق ادا کیا۔

آج صوفیائے کرام چشمِ پرنم اور قلب گداز سے ہر منبع فیوض و عرفاں کی یاد میں مصروف ہیں اور قلب کو منور سے منور تر کرتے جاتے ہیں۔ مرثیہ نگار شعراَ اپنی عقیدت اور فکرِ رسا کا اظہار الفاظ سے کرتے اور اپنی والہانہ محبت کا نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں، ایک قلوب کو مسخر کرتا ہے۔ دوسرا قلوب میں غم د الم کا طوفان برپا کرتا ہے اور دعوتِ فکر و عمل دیتا ہے۔

جناب آغا سکندر مہدی جن سے ملاقات کا شرف مجھے بہاولپور میں حاصل ہوا۔ یہاں کے وہ واحد مرثیہ گو شاعر ہیں۔ جن کے کلام سے استفادہ کا موقع ملا ہے اور جنہوں نے پیشِ لفظ لکھنے کی دعوت دے کر اس مبارک یاد میں شرکت کی سعادت عطا فرمائی ہے جس

کے متعلق کسی بزرگ نے کہا ہے۔

"بنا کردن چہ رسم خوش بخوں وخاک غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

مرثیہ نگاری پر کچھ لکھنا بھی آج اتنا ہی مشکل ہوگیا ہے۔ جتنا کہ خود مرثیہ کہنا۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیے کے تمام اجزا سے لیکر ان کے جزیات تک کو کچھ اس انداز سے مرثیہ میں سمو لیا ہے۔ کہ اظہار عقیدت کے سوا۔ اس میں کوئی نئی راہ پیدا کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جن عظیم شخصیتوں کی حیاتِ طیبہ کا مرثیہ ترجمان ہے وہ لا محدود جاذبیت اور وسعت کی مالک اور خلقِ عظیم کے اخلاق کا آئینہ ہیں اور ان کا ذکر اگر اخلاص سے کیا جائے تو مرثیہ خود نئی راہیں ہر شخص کے اپنے حوصلے اور ظرف کے مطابق نکلتی آتی ہیں۔ البتہ یہ شرف انیسؔ و دبیرؔ کو ہمیشہ حاصل رہے گا کہ جملہ اصنافِ شاعری میں جو رعنائیاں تھیں ان کو ایک معصوم اور پُر کیف انداز سے انہوں نے مرثیے میں اس طرح جذب کر لیا کہ مرثیہ میں ہر صنفِ شاعری کے محاسن جھلکنے لگے۔ کہیں غزل کی کیف سامانیاں ہیں کہیں قصیدے کا شکوہ الفاظ کہیں مثنوی کی واقعات نگاری اور منظر کشی ہے تو کہیں فردوسیؔ کی رزمیہ شاعری کی جھلک اور کہیں سعدیؔ و رومیؔ کا جذبۂ اخلاص و اخلاق۔

انیسؔ اور دبیرؔ کا زمانہ لکھنؤ کی ٹمٹماتی ہوئی شمع تہذیب کا

آخری دور تھا۔ آج زمانہ بدل چکا ہے، گھوڑے اور تلوار کی
جزیات میں دورِ حاضر کے لئے کوئی کشش نہیں۔ یہ حقائق کو
بے نقاب کرنے کا دور ہے۔ فیضانِ نورِ رسالت سے قلوب
کو قریب لانے، ان کو سنوارنے کا دور ہے، جزیات سے
اجمال میں لانے، صحتِ عقیدہ، حسنِ معاشرہ تہذیبِ نفس پر نوجوانوں
کو گامزن کرنے کا دور ہے۔ چنانچہ جناب آغا سکندر مہدی کے
لئے ان کے ذوقِ طبیعت نے خود ایک راہ مرثیے میں نکال لی
جو مرثیے میں خاص ان کا رنگ ہے۔ انھوں نے قدیم اندازِ بیان
چہرہ آمد، رجز، جنگ، گھوڑا، تلوار وغیرہ کی موشگافیوں کو ترک کرکے
دورِ حاضر کے اذہان کو متاثر کرنے کی صاف اور سیدھی روشِ راہ اختیار کی
وہ رسول اور آلِ رسول کی محبّت کو نقطہ ایمانی قرار دے کر پہلے توحید
کا بیان کرتے ہیں، پھر رسالت کا دونوں جگہ توفیقِ الٰہی ان کی دستگیری
کرتی ہے۔ پھر آستانہ نبوت سے یہ عقیدت اور محبت ان کو آل
رسول کے قدموں میں لا ڈالتی ہے اور وہ حضرت امام حسین علیہ السلام
ان کی آل اولاد، اعزا اور رفقا، ہر کسی ایک کا ذکر اس اخلاص و
محبّت اور عقیدت سے کرتے ہیں۔ کہ سننے والوں کے دل گداز
ہو جاتے ہیں چشمۂ فیض ان کی آنکھوں سے جاری ہو جاتا ہے۔ ان
کی زبانوں پر سبحان اللہ و ماشاء اللہ اور دل سے درود و سلام
کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔

آغا صاحب کے مرثیے میں ان کی عقیدت، اخلاص، ہدایت کی تمنا، مغفرت کی تڑپ بیک وقت جھلکتی رہتی ہے۔ چنانچہ جو مرثیہ منظر عام پر آ رہا ہے۔ وہ سید الشہدائ حضرت امام حسینؓ کے حال میں ہے۔ اس کا آغاز بھی اسی نقطۂ ایمانی سے ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

مطلعِ فکر ہے ایماں کی ضیائ سے روشن
شیشۂ قلب ہے ایقان کی جلا سے روشن
دیدۂ چشم ہے عرفان کی فضا سے روشن
چشمۂ روح ہے قرآں کی ہوا سے روشن
ذکرِ معبودِ حقیقی سے زباں روشن ہے
جودتِ فکر سے اندازِ بیاں روشن ہے

ساتھ ہی حمد اور حضور کی شان میں عقیدت کے پھول پیش کیے گئے ہیں اور نہایت ہی پُر اثر انداز سے جس میں عجز و انکسار کے ساتھ ساتھ زورِ قلم بھی آشکارا ہے اور زورِ طبع بھی، لطفِ زباں بھی اور بندش کی چُستی بھی، الفاظ پہ قدرت بھی اور تشبیہات کی ندرت بھی اور فکر و بیاں کی دلکشی اور جاذبیت بھی اور یہ سب اس اعتراف کے ساتھ ہے کہ:-

جو ملا مجھ کو وہ توفیقِ الٰہی سے ملا

اس کے بعد، زبان اردو جو مذہب کے بعد مسلمان پاکستان

کا دوسرا رشتہ اتحاد ہے۔ اس کا تاریخی انداز سے ذکر فرماتے ہیں
اور اس ربط اور تعلق پر روشنی ڈالتے ہیں، جو شعرائے اہل بیتؑ کو
کو زبان اردو سے رہا ہے۔ اور جس کے سبب مرثیے نے وہ عظمت
پائی بقول خود ان کے ؎

مثنوی ہو کہ قصیدہ کہ رباعی کہ غزل
مرثیہ نظم کی اصناف میں سب سے افضل

یہاں سے گریز کرتے ہیں اور اس نورِ مبیں کی شعاعوں سے اپنے مرثیے کو آراستہ کرتے ہیں۔ کربلا کے جانکاہ واقعات کا بیان جو کہا ہے وہ خوب کہا ہے۔ یہاں محبّت ہی محبّت ہے، محبّت کے علاوہ کسی جذبے کو دخل نہیں اور جہاں محبّت دستگیر ہو جائے وہاں رحمت کا دامن کیوں نہ ہاتھ آئے۔ اللہ کی رحمت کیوں دستگیری نہ کرے عاقبت کیوں نہ سنور جائے۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ آغا صاحب کو ہمیشہ اپنی عنایات سے نوازتا رہے اور ان کے قلب کو مقام حسینیّت اور حُسینیّت سے اور بھی منوّر فرمائے آمین!

(ڈاکٹر) سید حامد حسن بلگرامی
۱۲؍ اگست ۱۹۶۹ء
رئیس الجامعہ ہاؤس، قائد اعظم روڈ۔ بہاولپور۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطلع

مطلعِ فکر ہے ایماں کی ضیا سے روشن

شیشۂ قلب ہے ایقاں کی جِلا سے روشن

دیدۂ چشم ہے عرفاں کی فضا سے روشن

چشمۂ روح ہے قرآں کی ہوا سے روشن

ذکرِ معبودِ حقیقی سے زباں روشن ہے

جودتِ فکر سے اندازِ بیاں روشن ہے

لائقِ حمد و ثنا ذاتِ خداوند کریم
خالقِ ارض و سما، رازق و رحمٰن و رحیم
مُنعم و ربِ عُلا، قادر و قدوس و قدیم
مالکِ روزِ جزا، عادل و اعلیٰ و عظیم

نور کی اس کے ہر اک سمت فراوانی ہے
ذات ہے اس کی احد، واحد و لاثانی ہے

۳

ہاں مگر ذاتِ الٰہی کا سمجھنا ہے محال

عقل مجبور ہے، محدود ہے انساں کا کمال

فکر کیا چیز ہے؟ اک دائرۂ وہم و خیال

ذہن پا جائے اسے یہ کہاں انساں کی مجال

چشمِ موسیٰ نے کہاں طور کا جلوہ دیکھا؟

اور ہی نور تھا، جس نور کا جلوہ دیکھا

فکر کا ساتھ نہ دیتی تھی مری طبعِ رسا

یک بیک آئی مجھے ہاتفِ غیبی کی ندا

کلمۂ پاک کے الفاظ یہ دیتے ہیں صدا

کوئی معبود زمانے میں نہیں اس کے سوا

نکہتِ گُل سے مُعطر جو صبا آئی ہے

حمد و تسبیح کی ذروں سے صدا آئی ہے

بعدِ معبود، محمدؐ ہیں جہاں سے افضل

شافعِ روزِ جزا، عبد و نبی و مرسل

وجۂ تخلیقِ جہان، منبعِ اسباب و عللؔ

کلمۂ پاک کا جزو، نورِ مبیں اوّل

ذاتِ مخفی کا جو ظاہر نہ خزانہ ہوتا

ہفت افلاک نہ ہوتے، نہ زمانہ ہوتا

جب زمانے کو ہوئی مدحِ محمدؐ کی خبر
عرش نے بڑھ کے نچھاور کئے تاروں کے گُہر
سر جُھکائے ہوئے مُجرے کو بڑھے شمس و قمر
بہرِ تسلیم نمودار ہوا نورِ سحر

جذبۂ عشق بڑھا اوجِ فلک پر چھایا
داد دینے کے لئے مجھ کو عطارد آیا

۷

موجۂ عطر لئے آئی گلستاں سے صبا
پیشوائی کو بڑھی خاک کے ذروں کی ضیا
بے کلی حد سے بڑھی ضبط کا یارا نہ رہا
چھوڑ کے تختِ سلیماں کو چلی آئی ہوا
برکتیں عرش سے رحمت کا فرشتہ لایا
جامِ کوثر مری قسمت کا نوشتہ لایا

باعثِ عظمتِ تحریر ہے، جامِ کوثر

نُدرتِ فکر کی تنویر ہے جامِ کوثر

مصحفِ عشق کی تفسیر ہے جامِ کوثر

مرثیہ لکھنے کی تدبیر ہے جامِ کوثر

زینتِ فرش بنا گُل کی قبا کا دامن

سر پہ سائے کو بڑھا آلِ عبا کا دامن

پرفشاں جوشِ عقیدت میں ہے طاؤسِ سخن

نعرہ زن فرطِ مودت سے ہیں مرغانِ چمن

سورۂ دہر ہوا وردِ زبانِ سوسن

بربطِ نطق بنا موجِ صبا کا دامن

گفتگو ہوتی ہے شبیر کے پروانوں سے

داد ملتی ہے مجھے شہ کے ثناخوانوں سے

اہلِ مجلس میں ہوا تذکرۂ شعر و سخن
با ادب ہو کے بڑھا ولولۂ شعر و سخن
سرِ افلاک گیا غلغلۂ شعر و سخن
گرمیِ بزم بنا طنطنۂ شعر و سخن
زورِ تقریر سے لفظوں میں روانی آئی
ذکرِ سرکار سے اعجاز بیانی آئی

وسعتِ فکر و نظر، زمزمۂ شعر و سخن

لذتِ قلب و جگر، زمزمۂ شعر و سخن

معدنِ لعل و گہر، زمزمۂ شعر و سخن

مخزنِ علم و ہنر، زمزمۂ شعر و سخن

حدتِ فکر سے جب قلب پگھل جاتا ہے

جذبۂ سوزِ دروں شعر میں ڈھل جاتا ہے

رُکنِ ایوانِ سلاست ہے مرا طرزِ سخن

مصدرِ نورِ فصاحت ہے، مرا طرزِ سخن

منبعِ حُسنِ بلاغت ہے مرا طرزِ سخن

گوہرِ تاجِ عبارت ہے، مرا طرزِ سخن

قصرِ اقلیمِ سخن شاہ کی شاہی سے مِلا

جو مِلا مجھ کو وہ توفیقِ الٰہی سے مِلا

فرشِ مجلس کی ہے مرہون زبان اُردو

غمِ شبیرؑ بنا روحِ روانِ اردو

نامِ مولا سے بڑھا نام و نشانِ اردو

شعلۂ طور ہوا زورِ بیانِ اردو

گوشۂ بزمِ عزا باعثِ اعجاز ہوا

ماتمِ سبطِ نبیؐ نقطۂ آغاز ہوا

جبکہ طے اُس نے کئے علم و اَدب کے میداں

بات ہونے لگی پھر چشمۂ اردو ہے کہاں

اہلِ تحقیق کی کاوش سے ہوا سب پہ عیاں

سر فہرست ہے وہ مجلس فضلیٰ کا بیاں

پرورش پاتی رہی ذوقِ حق آگاہی میں

خوب پروان چڑھی دورِ قطب شاہی میں

یُوں تو اردو میں ہے موجود ہر اک صنفِ سخن
چار اطراف میں بکھرا ہے رباعی کا چمن
گُل و بُلبل سے ہے بھرپور غزل کا دامن
زینتِ دامنِ اُردو ہے قصیدے کی پھبن
مثنوی قوتِ تخئیل کا ہے حسنِ عمل
ہاں مگر مرثیہ تخلیق کا ہے تاج محل

مرثیہ شدتِ افکار کا بہتا دریا

مرثیہ عظمتِ افکار کا بہتا دریا

مرثیہ شوکتِ افکار کا بہتا دریا

مرثیہ ندرتِ افکار کا بہتا دریا

مثنوی ہو کہ قصیدہ کہ رباعی کہ غزل

مرثیہ نظم کی اصناف ہیں سب سے افضل

١٧

مرثیہ حسنِ خیالات میں سب سے افضل

مرثیہ شدتِ جذبات میں سب سے افضل

مرثیہ حمد و مناجات میں سب سے افضل

مرثیہ فن کی روایات میں سب سے افضل

مدحتِ آلِ محمدؐ کا وظیفہ کہیے

ذکرِ سرکارِ دو عالم کا صحیفہ کہیے

اپنے مقصد کی طرف مجھ کو صبا لاتی ہے

ذکر و اذکار کی مجلس میں بہار آتی ہے

اَوج کس درجہ مری طبعِ رسا پاتی ہے

عرش پر آنکھ ثریا سے لڑی جاتی ہے

ہر طرف حُسن ہے، اک عالمِ رعنائی ہے

روشنی خاک کے ذروں میں سمٹ آئی ہے

مدحِ ممدوحِ الٰہی سے زباں روشن ہے
چشم روشن ہے مری، طبع رواں روشن ہے
پرتوِ حُسن سے اندازِ بیاں روشن ہے
جلوۂ طور ہے یا قلبِ نہاں روشن ہے

نورِ اوّل کی جو لفظوں میں جھلک پاتی ہے
مُشتری چاند کے پہلو میں چھُپّی جاتی ہے

مصدرِ نور ہوئی مدحِ محمدؐ میں زبان
ذکرِ سرکارِ دو عالم سے بڑھا حُسنِ بیاں
بر لبِ نطق پہ آنے لگے افکارِ نہاں
ساغرِ دل سے چھلکنے لگا نورِ ایماں
جذبۂ عشق مرا تا بہ ثریّا پہونچا
نعرۂ صلِّ علیٰ عرشِ بریں تک پہونچا

باعثِ عظمتِ کونین ہے حضرتؐ کا ظہور
روز و شب آتے تھے جبریلِ امیں جنکے حضور
ماہ و خورشید کہاں اور کہاں پیکرِ نور
ہے فقط بحثِ عبث تذکرۂ جلوۂ طور

حضرتِ یوسفِ کنعاں میں جو زیبائی تھی
نورِ سرکارِ دو عالم کی جھلک پائی تھی

نور سے جس کے منوّر تھی جبینِ آدم
ذِکر سے جس کے چلا سلسلۂ لوح و قلم
جس کے قدموں کی ضیا حسنِ بساطِ عالم
جس کی ہستی ہوئی عالم کے لئے ابرِ کرم

جس کے صدقے میں ضیا حورِ سحر نے پائی
جس کے پرتو سے چمک شمس و قمر نے پائی

وصفِ سرکارِ دو عالم سے کھلی دل کی کلی

آشکارا ہوئے سب راز خفی ہوں کہ جلی

موجۂ فکر رسا نور کے سانچے میں ڈھلی

یک بیک آ گیا ہونٹوں پہ مرے نامِ علیؑ

بعدِ تکمیلِ نبوت جو امامت آئی

پرورش کے لئے پہلے سے نبوت آئی

مظہرِ ختمِ رسل، نفسِ پیمبر ہیں علیؑ
زینتِ بزمِ عمل، رونقِ ممبر ہیں علیؑ
سطوتِ کشورِ حق، فاتحِ خیبر ہیں علیؑ
بازوئے مصطفوی، قوتِ داور ہیں علیؑ

آپ کے واسطے سرکار یہ فرماتے ہیں
"حق اُدھر جاتا ہے جس سمت علیؑ جاتے ہیں"

شاہِ ابرار علیؑ، سیّد و سردار علیؑ

دیں تلوار علیؑ، قاتلِ کفار علیؑ

غیرِ فرار علیؑ، حیدرِ کرار علیؑ

حق طلبگار علیؑ، حق کے طلبگار علیؑ

حکمِ سردارِ دو عالم ہے علیؑ اولیٰ ہیں

"جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علیؑ مولا ہیں"

مردِ مومن کے لئے ذاتِ علیؑ مہرِ مبیں

مردِ مومن کے لئے ذاتِ علیؑ نیرِ دیں

مردِ مومن کے لئے ذاتِ علیؑ حبلِ متیں

مردِ مومن کے لئے ذاتِ علیؑ عزم و یقیں

سرِ میدانِ وغا نام سے دل بڑھتے ہیں

استقامت کے لئے نادِ علی پڑھتے ہیں

۲۷

زندگی خوفِ الٰہی میں ہوئی ساری بسر

عمر بھر حق کی حفاظت میں رہے سینہ سپر

مثلِ سائے کے رہے گردِ حضورِ انور

ہر نفس مرضئ معبود رہی پیشِ نظر

جب کبھی نامِ محمدؐ کا لیا جاتا ہے

خود بخود نامِ علیؑ ساتھ میں آجاتا ہے

رونقِ دینِ مبیں، سطوتِ اسلام علیؑ

باعثِ عزم و یقیں، شوکتِ اسلام علیؑ

دولتِ حق کے امیں، حشمتِ اسلام علیؑ

دینِ احمد کے معیں، عظمتِ اسلام علیؑ

منزلت اُن کے سبب دینِ مبیں نے پائی

جب پڑا وقت تو اولادِ علیؑ کام آئی

جبکہ اسلام کی تذلیل ہوئی بر سرِ عام
اور ہونے لگا پامال شریعت کا نظام
مسخ ہونے لگے عالم میں اصولِ اسلام
فسق نے کر دیا پیغامِ نبیؐ کو بدنام

دیکھ کے رنگِ سیاست کو حسینؑ ابنِ علیؑ
اُٹھ پڑے حق کی حفاظت کو حسینؑ ابنِ علیؑ

جانِ خاتونِ جناں، جاں پیمبر ہیں حسینؑ

وارثِ شیرِ خدا، ثانی حیدر ہیں حسینؑ

حسنِ اخلاق حسن، قوتِ شبر ہیں حسینؑ

عظمتِ نوعِ بشر، ہادی و رہبر ہیں حسینؑ

بڑھ گیا اُن کے سبب حُسنِ قبولِ اسلام

ان سے قائم رہے دُنیا میں اصولِ اسلام

اہلِ ایماں کے لئے قوتِ المان حسینؑ

اہلِ تقویٰ کے لئے باعثِ ایقان حسینؑ

اہلِ عرفاں کے لئے مرکزِ عرفان حسینؑ

اہلِ قرآن کے لئے بولتا قرآن حسینؑ

آپ تفسیر بنے آیتِ قرآنی کی

جان کی، مال کی ثمرات کی قربانی کی

سالکِ راہ رضا، عزم کا پیکر ہیں حسینؑ

راکبِ دوشِ نبی مہرِ منوّر ہیں حسینؑ

مالکِ باغِ جناں، سبطِ پیمبر ہیں حسینؑ

مظہرِ نورِ خدا طاہر و اطہر ہیں حسینؑ

آپ آئے تو سندِ مہرِ نبوت آئی

آل کی شان میں تطہیر کی آیت آئی

اِک نئے رنگ سے قائم کیا عنوانِ جہاد

عقل حیران ہے کیسے کیا اعلانِ جہاد

منفرد سارے زمانے سے تھا سامانِ جہاد

ساتھ میں اُن کو لیا جنکو تھا ارمانِ جہاد

نصرتِ حق کے لئے آلِ پیمبر کو لیا

جنگ کرنے کے لئے اکبر و اصغر کو لیا

ساتھ میں حضرت عباسؑ دلاور کو لیا

عون و جعفر کو لیا، دلبرِ شبّر کو لیا

باغِ اسلام کے اک ایک گُلِ تر کو لیا

بہرِ تکمیلِ مُہم ساتھ میں خواہر کو لیا

غازۂ حُسنِ عمل چہرۂ اقدس پہ مَلے

رونقِ شہر لئے شاہ مدینے سے چلے

کان میں آتی رہی دیر تلک ایک صدا
ہائے اکبر بھی گئے ہو گئے اصغر بھی جُدا
رہ گئی روتی ہوئی فاطمہ صغرا تنہا
دیکھئے آتے ہیں کب پھر کے وطن میں بابا

نالے بیمار کے کانوں سے جو ٹکراتے تھے
ہوک اٹھتی تھی کلیجے میں لرز جاتے تھے

آ کے مکّے میں کیا جب شہِ والا نے قیام
حق کی امداد کو آنے لگے کوفے سے پیام
ان کی نصرت کی حقیقت کو سمجھتے تھے امام
بھیجا مسلم کو اُدھر، ہو گئی حجت بھی تمام
حج کو عمرے میں بدل کر شہِ ابرار چلے
نورِ کعبہ کا لئے سیّد و سردار چلے

۴۷

کیا بیاں کوئی کرے شہ کی قیادت کا اثر
حق کو سینے سے لگائے تھا حسینیؑ لشکر
کچھ نہ تکلیف کا احساس نہ مرنے کا خطر
تھی فقط مرضیٔ معبودِ حقیقی پہ نظر
حُسنِ اخلاص سے افکار میں یکتائی تھی
سب نے مولا کی رفاقت کی قسم کھائی تھی

سُرخ رو شوق شہادت سے تھا ہر پیر و جواں
روشنی حق و صداقت کی تھی چہروں سے عیاں
ان کے اعمال تھے آئینہ جذباتِ نہاں
مثل پروانوں کے تھے گردِ شہنشاہ زماں

خونِ ناحق جو بہا، دولتِ عقبیٰ پائی
سرفروشی کی جزا مرضیِ مولا پائی

روزِ عاشور عجب وقت قیامت کا پڑا

لُٹ گیا عصر تلک قافلہ شاہِ ہُدیٰ

جان ایک ایک نے دی کوئی بھی باقی نہ رہا

جنگ کرنے کے لئے رہ گئے سرور تنہا

صبر کرتے تھے بڑا جبکہ جلال آتا تھا

اُمتِ جد کی تباہی کا خیال آتا تھا

رن میں تنہا تھے کھڑے بادشہ عرش مقام

نہ اعزّہ تھے نہ انصار، نہ یاور نہ غلام

تھی فقط فوج عدو گردِ شہنشاہ انام

کوئی اپنا نہ تھا موجود، اکیلے تھے امام

سامنے خاک پہ تھا نورِ نظر کا لاشہ

جلتی ریتی پہ تھا، اکبر سے پسر کا لاشہ

باوجود اس کے نہ تھی چہرۂ اقدس پہ شکن
دل کے ٹکڑے تھے پڑے سامنے بے گور و کفن
منتشر خاک پہ تھا فاطمہ زہرا کا چمن
مطمئن قلب تھا، تھی حق کی حمایت کی لگن
مظہر ذاتِ خدا ثانی حیدر تھے حسینؑ
عزم کا کوہ گراں، صبر کا پیکر تھے حسینؑ

تیر آئے تو کیا فوجِ مُخالف سے کلام
مُجھ سے پرخاش ہے کیا اسپئہ کوفہ و شام
حق پرستوں پہ کئے جور زمانے کے تمام
رکھ دیئے تُم نے پسِ پشت اصولِ اسلام

کیا عجب اجرِ محمدؐ کی رسالت کا دیا
آل کو ان کی مودت کے عوض قتل کیا

آخری بار سُناتا ہوں تمہیں حق کا پیام

پیش کرتا ہوں محمدؐ کی شریعت کا نظام

پھر بتاتا ہوں تمہیں اصلِ اصول اسلام

فرض ہے نصرتِ حق سب پہ پکارے جو امام

راہ پر اب بھی جو آجاؤ بہل ہو تقصیر

درگذر خون سے ان سب کے کریگا شبیرؑ

سُن کے حضرت کے یہ الفاظ ہنسے بانیٔ شہر

مُہر تھی دل پہ لگی کچھ نہ ہُوا اُن پہ اثر

بولے ہم کو نہیں کچھُ دینِ محمدؐ کی خبر

آپ کا خون بہانے پہ تُلا ہے لشکر

حق کِسے کہتے ہیں، ہم حق کے طلبگار نہیں

دینِ اسلام ہے کیا ہم کو سروکار نہیں

سرکشی دیکھ کے اعدا کی یہ سرورؑ نے کہا
حد سے آگے نہ بڑھو، کچھ تو کرو خوفِ خدا
موجبِ قہرِ الٰہی نہ بنے ظلم و جفا
اس سے ہوتا نہیں کچھ تم کو خسارے کے سوا
وارثِ شیرِ خدا، حیدرِؑ کرار ہوں میں
موت کا خوف ہے کیا حق کا طلبگار ہوں میں

امتیازِ حق و باطل کا نہیں تم کو شعور
بس سمجھ رکھا ہے تم نے ہمیں بے بس مجبور
ہم تو ہیں تابعِ فرمانِ خداوند غفور
سرِ تسلیم ہے خم اس کی مشیّت کے حضور
ورنہ دریا سے بھلا ہم کہیں ہٹ سکتے تھے
مرے عباسؑ کے بازو کہیں کٹ سکتے تھے

ہائے عباس کہ حسین کو نہ ہلا اذن وغا

ورنہ میداں کا کچھ اور ہی ہوتا نقشا

وہ شجاعت میں علیؑ ابن ابی طالب تھا

رن میں پانی کے، عوض، خون کا دریا بہتا

مرضیٔ حق کو لئے، حق کا طلبگار گیا

دل میں ارمان لئے میرا علمدار گیا

یاد تو ہو گا تمہیں بدر و اُحد کا میداں
زعم میں طاقت و کثرت کے تم آئے تھے جہاں
جب چلی حیدرؑ کرار کی تیغ بُرّاں
ایسے بھاگے تھے کہ ملتا نہ تھا قدموں کا نشاں

پھر وہی زورِ یداللہ دکھاتا ہے حسینؑ
لو! چلو! آؤ کہ میدان میں آتا ہے حسینؑ

یا علی کہہ کے کیا فوج پہ حملہ اک بار

بن گئی قہرِ خدا ابنِ علی کی تلوار

سامنے آ کے بچا کوئی نہ پیدل نہ سوار

ہر طرف کشتوں کے پشتے تھے سروں کے انبار

شور اُٹھا سپہ شام کی شامت آئی

آسماں چیخ پڑا رن میں قیامت آئی

خوف سے ہو گیا میدانِ وغا زیر و زبر

شہ کی تلوار سے کٹ کٹ کے گرے بانیٔ شر

تن گرا ایک طرف، ایک طرف کاسہ سر

خون کا دریا تھا رواں بھاگ رہا تھا لشکر

شور تھا نوح کے طوفان کی نشانی دیکھو

سر سے اونچا ہوا تلوار کا پانی دیکھو

ابتری پھیل گئی رن سے ستمگر بھاگے
کھل بلی مچ گئی کفار کے لشکر بھاگے
جان بچانے کے لئے ظلم کے خوگر بھاگے
منتشر چھوڑ کے افواج کو، افسر بھاگے

اپنی فوجوں کو کچلتے ہوئے اسوار گئے
پھینک کے تیر و کماں رن سے کماندار گئے

پیشِ مولا تھا مگر وعدۂ طفلی کا خیال

یاد نانا کو کیا، تھم گیا حضرت کا جلال

خون زخموں سے بہا، ہو گئے سرکار نڈھال

جلتی ریتی پہ گرے شاہِ زمن وقتِ زوال

سایۂ ظلم عدو، نیّرِ دیں پر آیا

راکبِ دوشِ نبیؐ فرشِ زمیں پر آیا

حال یہ دیکھ کے بھاگے ہوئے لشکر پلٹے
جان لینے کیلئے ظلم کے خُوگر پلٹے
تیر و خنجر لئے ہاتھوں میں ستمگر پلٹے
منتشر فوج کے بھاگے ہوئے افسر پلٹے

گھر گئے پھر شہِ ابرار ستمگاروں میں
چھُپ گیا مہرِ مُبیں شام کی تلواروں میں

تھے جو مصروف عبادت میں شہ جن و بشر

تیر مارا کسی ظالم نے کسی نے پتھر

گر پڑے خاک پہ تیورا کے حضورِ انور

عصر کا وقت تھا سجدے میں گیا آپکا سر

فرضِ طاعت کو ادا وقت قضا کرتے تھے

ساتھ ہیں بخششِ اُمّت کی دعا کرتے تھے

روح فرسا تھا عجب دشت بلا کا منظر

اِک طرف بیکس و مجبور علی کی دُختر

اِک طرف چوُر تھا زخموں سے محمدؐ کا پسِر

ناگہاں خوں میں بھرا شمرِ شقی کا خنجر

بھوکے پیاسے نے جو معراج عبادت پائی

آندھیاں سُرخ اٹھیں شہ نے شہادت پائی

کر دیا سید لولاک کے پیارے کو شہید

کر دیا فاطمہ کی آنکھ کے تارے کو شہید

کر دیا حیدرؑ صفدر کے دلارے کو شہید

کر دیا زینبؑ بےکس کے سہارے کو شہید

خاک اڑاتی تھی زمیں چشم فلک گریاں تھی

لاشِ شبیرؑ کی پامال سم اسپاں تھی

بے سہارا جو ہوئیں زینب و اُمِّ کلثوم
یادِ خالق میں تھیں مصروف بہ حالِ مغموم
جابجا چھپ گئے سہمے ہوئے بچے معصوم
جانبِ خیمہ بڑھا فوجِ مخالف کا ہجوم

دولتِ فاطمہ و حیدرِ کرار لٹی
آگ خیموں میں لگی عترتِ اطہار لٹی

ظلم پر اپنے تھا مسرور یزیدی لشکر

لُوٹنے کے لئے خیموں کو بڑھے بانیٔ شر

چھین لی زینبِ مظلوم کے سَر سے چادر

شمر نے نوچ لئے بالی سکینہ کے گُہر

شور تھا، آلِ محمدؐ کا گھرانا لوٹو

دینِ اسلام کے بانی کا خزانا لوٹو

اے قلم صبر کہ لکھنے کی نہیں تاب و تواں

جا بجا دامنِ قرطاس سے اُٹھتا ہی دھواں

مومنوں کیلئے کافی ہے شہادت کا بیاں

اشک آ جاتے نہیں بحرِ مودت ہے رواں

منزلت اور بھی کچھ طبع رسا پائے گی

عاقبت مرثیہ کہنے سے سنور جائے گی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حاملِ رایتِ اقلیمِ وفا ہیں عباس

آغا سکندر مہدی کا مرثیہ القمر جو جناب ابوالفضل العباس کے حال میں کہا گیا ہے، میں نے آغا صاحب سے پچھلے سال ایک مجلس میں سنا۔ آغا صاحب کا پڑھنے کا انداز بہت خوب ہے اور یہ ان کا اپنا انداز ہے جس میں لکھنوی انداز کی اداکاری ہے وہ الفاظ میں جان ڈال دیتے ہیں اور ہر واقعہ کی ایسی تصاویر بناتے ہیں جو سامع کے ذہن سے کبھی نہیں مٹتی۔ پچھلے سال آغا صاحب سے مرثیہ سننے کے بعد مدت تک تصور میں خط اٹھاتا رہا۔ اب مرثیہ پڑھنے کا موقع ملا تو مرثیہ کی فنّی اور معنوی خوبیاں اور اجاگر ہوئیں۔ آغا صاحب کا تعلق اودھ سے ہے، وہ لکھنؤ کی زبان لکھتے اور بولتے ہیں۔ آغا صاحب کے اندازِ بیان میں دبستانِ دہلی کی سادگی بھی ہے اور دبستانِ لکھنؤ کی پرکاری بھی۔ ان دونوں کے امتزاج نے اس مرثیہ کو فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے ایک بلند پایہ مرثیہ بنا دیا ہے۔ آغا صاحب نے خالص لکھنوی انداز میں فصیح تر الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور صنعت الفاظ کے ساتھ ساتھ معنویت کے پہلو بھی بہت بلند رکھا ہے۔ آغا صاحب کے کلام میں بے جا مبالغہ کو دخل نہیں۔ روزمرہ اور تشبیہات و استعارات کے موزوں استعمال

سے آغا صاحب نے اس مرثیہ کو نہایت دلکش اور پُر اثر بنا دیا ہے۔

میں اپنے آپ کو اس شہ پارہ ادب پر تبصرہ کرنے کے قابل نہیں سمجھتا کیونکہ نہ تو میرے پاس آغا صاحب جیسا ذخیرہ الفاظ ہے اور نہ انداز بیان تاہم چند سطریں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جن فنّی اور معنوی خوبیوں کا یہ مرثیہ حاصل ہے وہ پوری طرح احاطہ تحریر میں مجھ سے نہیں آسکتیں۔

مرثیہ کی تمہید نہایت پراثر ہے اور کسی حد تک نئی ہے مصنف نے مرثیہ کے روایتی اجزا سے انحراف کر کے ایک نئی روش اختیار کی ہے۔ مرثیہ کا آغاز دین اسلام کی افضلیّت سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد نبوت کا بیان ہے رسول مقبول صلعم کی شان میں ایک بند ملاحظہ ہو۔

سارے نبیوں کے ہیں سرتاج حضور انور
دینِ اسلام کی تکمیل ہوئی ہے جن پر
ربِ اکبر نے عطا کر دیا جن کو کوثر
آلِ اطہار بڑھی ہو گیا دشمن ابتر
فرض ہے آلِ محمد سے محبت کرنا
اجرِ تبلیغ رسالت ہے مودّت کرنا

مرثیہ لکھنے پر آمادگی کا اظہار کس عقیدت کے ساتھ کیا گیا ہے:

نور سینے میں لئے کلک طرحدار چلا
سر عقیدت سے جھکائے ہوئے زوار چلا
صبح صادق کو لئے مطلع انوار چلا
دُرّ فشانی کے لئے ابرِ گہربار چلا
شبِ معراج نے لکھنے کو سیاہی دیدی
سنگِ اسود نے امامت کی گواہی دیدی

اہلِ بیت کے مدح اور منقبت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ان کے دامن سے ہے وابستہ رضائے معبود
حکمِ خالق سے یہ شاہد ہیں زمانہ مشہود
ان کی توقیر ہے کس درجہ خُدا کو مقصود
جزو ایمان ہوا آلِ محمد پہ درود
عاقبت بنتی ہے دنیا بھی سنور جاتی ہے
زندگی ان کے تمسک سے نکھر جاتی ہے

وارثِ علم نبی، عکسِ صفاتِ یزداں
رونقِ صبحِ ازل موجۂ نورِ ایماں
مبداءِ فیضِ خُدا واقفِ اسرارِ نہاں
شارحِ دینِ مبیں نطقِ حدیث و قرآں
بحرِ حیرت میں زمانے کو ڈبو دیتے ہیں
ایک نقطے میں یہ قرآن سمو دیتے ہیں

تمہید کے بعد گریز نہایت پر مُغنی ہے موزوں اور بے ساختہ ہے حضرت عباس مجسمۂ ایثار و وقار ہیں۔ ان کی مدح سرائی سے پہلے ایثار و وفا کا بیان نہایت موزوں اور بر محل ہے۔

باعثِ عظمتِ انساں ہے وفا کا جوہر
موجبِ سطوتِ انسان ہے وفا کا جوہر
مظہرِ قوتِ انسان ہے وفا کا جوہر
زینۂ رفعتِ انسان ہے وفا کا جوہر
نام مٹ جاتا ہے دنیا میں جہانداروں کا
ہاں مگر تذکرہ رہتا ہے وفا داروں کا

حاملِ رایتِ اقلیمِ وفا ہیں عباس
باعثِ تقویتِ فوجِ خدا ہیں عباس
پیکرِ طاعت و تسلیم و رضا ہیں عباس
رونقِ سطنتِ دینِ ھُدیٰ ہیں عباس
ہے جو شانے پہ عَلم غالبِ کل غالب کا
ورثہ پایا ہے علی ابنِ ابی طالب کا

مضامین کی نوعیت کے اعتبار سے الفاظ استعمال کرنے پر آغا صاحب کو قدرت حاصل ہے۔ حضرت عباس علمبردار کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

مرکزِ حق و صداقت ہیں جنابِ عباس
محورِ عزم و شجاعت ہیں جناب عباس
واقفِ رمزِ اطاعت ہیں جنابِ عباس
سایۂ حسن امامت ہیں جناب عباس
یاد کس طرح سے معصوم نے فرمایا ہے
عبدِ صالح کا زیارت میں لقب آیا ہے

مظہرِ حیدرِ کرار جناب عباس
ثانیٔ جعفرِ طیارؔ جناب عباس
پسرِ سیدِ ابرار جناب عباس
لشکرِ حق کے علمدار جناب عباس
حق ادا کر دیا شبیر کی غمخواری کا
آج تک نام ہے دنیا میں علمداری کا

پھر علم کی تعریف اس طرح کی ہے۔

مرکزِ دولت ایماں کی علامت ہے علم
منبعِ چشمۂ عرفاں کی علامت ہے علم
سطوت حامل قرآں کی علامت ہے علم
قوتِ شاہ شہیداں کی علامت ہے علم
دل کے جذبات پھریرے سے عیاں ہیں اب تک
خونِ عباس کے چھینٹوں کے نشاں ہیں اب تک

مرد مومن کے لئے باعث ایقاں ہے علم
منبعِ علم و یقیں، قوتِ ایماں ہے علم
مظہر نورِ خدا، مرکزِ عرفاں ہے علم
اہل دانش کے لئے فکر کا ساماں ہے علم
کربلا جب کہ تصور میں نظر آتی ہے
خشک مشکیزے کی تصویر ابھر آتی ہے

حضرت عباس پانی لینے جاتے ہیں۔ محاکات اور مصوری کے اعتبار سے بند ملاحظہ:

دی جو حضرت نے رضا حق کا علمدار چلا
پانی لینے کے لئے شہ کا وفادار چلا
سوئے میدانِ وغا قاتلِ کفار چلا
غیر فرار چلا حیدر کرار چلا
ہوش مقتل میں شجاعوں کے اُڑے جاتے ہیں
شور دریا پہ ہے عباس علی آتے ہیں

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ صنعت الفاظ پر زور دینے سے کلام میں روانی نہیں رہتی یا کم ہو جاتی ہے اور واقعہ کی اصلی اور صحیح تصویر نہیں بنتی۔ آغا صاحب نے صنعت الفاظ کے باوجود کسی قدر خوبصورت تصویر بتائی ہے۔

بیچ دریا کے جو سقائے سکینہ آیا

اہلِ باطل کو ندامت سے پسینہ آیا
بڑھ کے تعظیم کو موجوں کا سفینہ آیا
سر جھکائے ہوئے پانی کا خزینہ آیا
تھا علمدار جو مشکیزۂ معصوم لئے
بڑھ کے دریا نے عقیدت سے قدم چوم لئے

ابرِ باراں نے خجالت سے جھکائیں آنکھیں
دیدۂ موج نے تلوؤں سے لگائیں آنکھیں
بڑھ کے گرداب نے قدموں میں بچھائیں آنکھیں
مارے غیرت کے نہ دریا نے اُٹھائیں آنکھیں
سانس ٹھنڈی جو ستمگار کے لشکر نے بھری
مشک سوکھی ہوئی عباسِ دلاور نے بھری

حضرت عباس کے بازو قلم ہو جانے کے واقعہ کی تصویر آغا صاحب نے اس طرح کھینچی ہے۔ کلام کس قدر مقتضائے حال کے مطابق ہے:

ابتری دیکھ کے یہ شمرِ ستمگر نے کہا
چارہ کوئی نہیں اب پشت سے حملے کے سوا
وار تلوار کا حضرت پہ اچانک جو ہوا
تن سے بازو وہ ہوا سقائے سکینہ کا جدا

ہاتھ کٹ جانے سے نیزے کا سہارا ٹوٹا
غل ملائک میں ہوا عرش کا تارا ٹوٹا

ناگہاں دوسرے بازو پہ بھی اک وار ہوا
ساتھ ہی ہو گیا ٹھنڈا علم فوج خدا
باوجود اس کے بھی سقائے سکینہ نہ تھما
ہاتھ کٹ جانے پہ مشکیزے کو دانتوں میں لیا
چار اطراف سے گو تیر چلے آتے تھے
صورت سرو رواں آپ چلے جاتے تھے

واقعہ نگاری میں چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا بلکہ اکثر موقعوں پر چھوٹے چھوٹے اور جزئی واقعات کے بیان سے اصل واقعہ کی پوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ بلاغت کے اس نکتہ سے آغا صاحب خوب واقف ہیں اور ایک ماہر فن کی حیثیت سے انہوں نے جزئی باتوں کو بیان کر کے کلام کو بے حد پُر تاثیر بنا دیا ہے۔ حضرت عباس سکینہ کیلئے پانی لینے کیلئے تھے۔ آخری وقت تک سکینہ سے جو پانی لانے کا وعدہ کیا تھا اُسے نہیں بھولتے اور ان الفاظ پر دم توڑ دیتے ہیں۔

رو کے یہ حضرت عباس نے سرور سے کہا

میں ہوں شہزادی سکینہ سے بہت شرمندہ
پانی لانے کا جو وعدہ تھا وہ پورا نہ ہوا
لاش خیمے میں نہ لے جائیں مری بہرِ خدا
کہتے کہتے یہ سخن شہ سے سدھارے عباس
مومنو! ہوگئے اللہ کو پیارے عباس

پچھلے کئی سال سے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد شعرا اور اہل علم میں مرثیہ کہنے اور مرثیہ پڑھنے کا شوق تازہ ہو رہا ہے اس صنف کو دوبارہ زندگی دینے میں اہل کراچی کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ اردو ادب میں مرثیہ کی ادبی حیثیت مسلّم ہے اس صنف نے اردو ادب اور زبان کی جو خدمت کی ہے اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا یہ وہ صنف ہے جس نے اردو کے دامن کو بیش بہا ادبی جواہر سے بھر دیا ہے اور یہ بات قطعاً صحیح ہے کہ اگر مرثیہ کو اردو ادب سے نکال دیا جائے تو شاعری کا نصف حصّہ نکل جاتا ہے۔ یہ وہ صنف ہے جس کا تعلق براہِ راست اخلاق سے ہے۔ انسانی ہمدردی صلح پسندی، ایثار و وفا، صبر و استقلال، زہد و تقویٰ تسلیم و رضا۔ خودی اور نفی خودی کی تعلیم مرثیہ میں موجود ہے ایسی مفید اور پاکیزہ صنف ادب پر توجہ نہ دینا اردو زبان

اور ادب کی بڑی بدقسمتی ہے۔ آغا صاحب قابلِ ستائش ہیں، جنہوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور جودتِ طبع کو مرثیہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ آغا صاحب کو اس صنفِ ادب سے فطری لگاؤ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آغا صاحب مرثیے لکھتے رہیں گے۔ اس صنف کو آغا جیسے فنکاروں کی ضرورت ہے۔

سید علی اختر زیدی
صدر شعبہ اُردو
کیڈٹ کالج، حسن ابدال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطلع

فکر کی ارض و سماوات میں جولانی ہے

شیشۂ دل کی جِلا قوتِ ایمانی ہے

قلزمِ حُسن خیالات میں طُغیانی ہے

رَبِ اکبر کی عنایات میں ارزانی ہے

دستِ خامہ میں نیا رنگِ حنا بھرتا ہوں

دینِ اسلام کو عنوانِ بیاں کرتا ہوں

دینِ اسلام ہے سر چشمۂ فیضِ یزداں

دینِ اسلام ہے احکامِ الٰہی کا بیاں

دینِ اسلام ہے دستورِ حیاتِ انساں

دینِ اسلام ہے انساں کے عمل کی میزاں

نوعِ انساں کو ہدایت کا یہ پروانہ ہے

امتیازِ حق و باطل کا یہ پیمانہ ہے

دینِ اسلام ہے توحید و عدالت کا بیاں

دینِ اسلام ہے پیغام و نبوت کا بیاں

دینِ اسلام ہے ایمان و امامت کا بیاں

دینِ اسلام ہے قرآں و قیامت کا بیاں

نوعِ انساں کو ہے پیغامِ رسولِ اسلام

پانچ ارکان پہ مبنی ہیں اصولِ اسلام

پہلے توحید کہ اللہ نہیں اُس کے سوا

دوسرے عدل کہ عادل ہے وہ ذاتِ یکتا

پھر نبوت کہ نبی لائے ہیں پیغامِ خُدا

اور امامت کہ حفاظت میں رہے دینِ ہُدیٰ

پانچواں رُکن ہے، اقرارِ قیامت کرنا

پھر شریعت پہ عمل کر کے عبادت کرنا

۵

حق کا پیغام زمانے میں نبی لاتا ہے

دین کے احکام زمانے میں نبی لاتا ہے

لطف و اکرام زمانے میں نبی لاتا ہے

فضل و انعام زمانے میں نبی لاتا ہے

بندۂ خاص ہے، معصوم وامیں ہوتا ہے

ہر نبی آئینۂ نورِ مُبیں ہوتا ہے

سارے نبیوں کے ہیں سرتاج حضورِ انور

دینِ اسلام کی تکمیل ہوئی ہے جن پر

ربِ اکبر نے عطا کر دیا جن کو کوثر

آلِ اطہار بڑھی، ہوگئے دشمن ابتر

فرض ہے آلِ محمدؐ سے محبّت کرنا

اجرِ تبلیغِ رسالت ہے مودت کرنا

۷

مدحتِ آلِ محمدؐ ہوئی عنوانِ سخن

نوکِ خامہ بنی صد رشکِ زبانِ سوسن

ہمہ تن گوش ہوئے زمزمہ پردازِ چمن

قلبِ مومن میں ہوئی شمعِ مودّت روشن

سامنے مصحفِ ناطق کے ورق روشن ہیں

اہلِ ایماں کے لئے چودہ طبق روشن ہیں

نور سینے میں لئے کلکِ طرحدار چلا
سرِ عقیدت سے جھکائے ہوئے زوار چلا
صبحِ صادق کو لئے مطلعِ انوار چلا
دُر فشانی کے لئے ابرِ گہر بار چلا
شبِ معراج نے لکھنے کو سیاہی دے دی
سنگِ اسود نے امامت کی گواہی دے دی

برابطۂ نُطق پہ جذبات اُبھر کر آئے

چشمۂ روح سے نغمات اُبھر کر آئے

ساغرِ دل سے خیالات اُبھر کر آئے

مرثیہ لکھنے کے لمحات اُبھر کر آئے

زورِ تحریر جو چُٹکی میں سمٹ کر آیا

مُعجزہ دیکھنے خورشید پلٹ کر آیا

مرثیہ معجزۂ فن ہے بہ فیضِ یزداں
جا بجا اس میں ہے آیاتِ الٰہی کا بیاں
حُسنِ انداز پہ نقاشیٔ مانیؔ قرباں
نُقطے نُقطے پہ ہے ترشے ہوئے ہیروں کا گماں

مرتبہ کیسا مجھے میرے سخن نے بخشا
قصرِ فردوس بریں شاہِ زمن نے بخشا

تھی تمنّائے دلی مرضیِ مولا کا حصول
دل سے نکلی تھی دُعا ہو گئی آخر مقبول
فکرِ پاکیزہ پہ ہونے لگا رحمت کا نزول
حُسنِ تخئیل بنا، تذکرۂ آلِ رسُول

زیرِ لب فن کی سَند، ماہرِ فن دیتے ہیں
ہو کے خوش اہلِ سخن، دادِ سُخن دیتے ہیں

اہلِ مجلس میں ہوا تذکرۂ آلِ عبا
مطلعِ روزِ ازل آئینۂ حسن بنا
بارشِ نور ہوئی ہو گئی معمور فضا
برکتیں ساتھ لئے سلسلۂ نور چلا

گُلِ عقیدت کے کھلے بادِ بہاری آئی
قائمِ آلِ محمدؐ کی سواری آئی

عرش و کرسی سے سوا مرتبۂ آلِ عبا
جن کو خالق نے کیا طیب و طاہر پیدا
کوئی بھی امر بجز حکم الٰہی نہ کیا
اپنے نفسوں کو جو بیچا تو ملی حق کی رضا
برکتیں عام ہیں، نعمات کی فیاضی ہے
یہ جو راضی ہیں بشر سے تو خدا راضی ہے

۱۴

وارثِ علمِ نبی، عکسِ صفاتِ یزداں
رونقِ صبحِ ازل، موجۂ نورِ ایماں
مبدأ فیضِ خُدا، واقفِ اسرارِ نہاں
شارحِ دینِ مبیں، نطقِ حدیث و قرآں

بحرِ حیرت میں زمانے کو ڈبو دیتے ہیں
ایک نقطے میں یہ قرآن سمو دیتے ہیں

ان کے دامن سے ہے وابستہ رضائے معبود

حکمِ خالق سے یہ شاہد ہیں زمانہ مشہود

ان کی توقیر ہے کس درجہ خدا کو مقصود

جزوِ ایمان ہوا آلِ محمدؐ پہ دُرُود

عاقبت بنتی ہے، دُنیا بھی سنور جاتی ہے

زندگی ان کے تمسّک سے نِکھر آتی ہے

زینتِ منبر و محراب عبادت ہیں یہی

حاملِ روشنیٔ عرشِ ولایت ہیں یہی

وارثِ سلطنتِ علمِ امامت ہیں یہی

جانشینِ شہِ سرکارِ رسالت ہیں یہی

شاہدِ کون و مکاں نیّرِ دیں کہتے ہیں

اہلِ ایماں انہیں نورِ مُبیں کہتے ہیں

مردِ میداں ہیں بھی، شاہ شہیداں ہیں بھی

دین و ایماں ہیں بھی، صاحب دوراں ہیں بھی

کلمۂ حق ہیں بھی، حق کے نگہباں ہیں بھی

نوکِ نیزہ کی قسم بولتا قرآں ہیں بھی

حق کی تائید میں کافی ہے شہادت اُنکی

بخشوائیگی سرِ حشر امامت اِنکی

ان کو ورثے میں ملا حق و صداقت کا پیام
ہیں یہی صاحبِ حق بعدِ رسولِ اسلام
ان کے اعمال کا آئینہ شریعت کا نظام
مقتدی سارا زمانہ، یہ زمانے کے امام

نوعِ انساں کو اگر حق کی طلبگاری ہے
الفتِ آلِ عبا، شرطِ وفاداری ہے

باعثِ عظمتِ انساں ہے وفا کا جوہر

موجبِ سطوتِ انساں ہے وفا کا جوہر

مظہرِ قوتِ انساں ہے وفا کا جوہر

زینۂ رفعتِ انساں ہے وفا کا جوہر

نام مِٹ جاتا ہے دُنیا سے جہانداروں کا

ہاں مگر تذکرہ رہتا ہے وفاداروں کا

حاملِ رایتِ تسلیم و وفا ہیں عباسؑ

باعثِ تقویتِ فوجِ خُدا ہیں عباسؑ

پیکرِ طاعت و تسلیم و رضا ہیں عباسؑ

رونقِ سلطنتِ دینِ ہُدیٰ ہیں عباسؑ

ہے جو شانے پہ عَلَم، غالبِ کُل غالب کا

ورثہ پایا ہے علی ابنِ ابی طالب کا

قوتِ بازوے شبیر جناب عباسؑ

نازشِ زینب دلگیر جناب عباسؑ

ہاشمی خون کی تنویر جناب عباسؑ

آلِ عمران کی تفسیر جناب عباسؑ

جوہرِ خاص وراثت میں چلے آئے ہیں

جز امامت کے، کل اوصاف علی پائے ہیں

مرکزِ حق و صداقت ہیں جنابِ عباس

محورِ عزم و شجاعت ہیں جنابِ عباس

واقفِ رمزِ اطاعت ہیں جنابِ عباس

سایۂ حُسنِ امامت ہیں جنابِ عباس

یاد کس طرح سے معصُوم نے فرمایا ہے

عبدِ صالح کا زیارت میں لقب آیا ہے

مظہرِ حیدرِ کرار جنابِ عباسؑ

ثانیٔ جعفرِ طیار جنابِ عباسؑ

پسرِ سیّدِ ابرار جنابِ عباسؑ

لشکرِ حق کے علمدار جنابِ عباسؑ

حق ادا کر دیا شبیر کی غمخواری کا

آج تک نام ہے دُنیا میں علمداری کا

روزِ اوّل جو محمدؐ نے سجایا تھا عَلم
رونقِ دینِ مبیں بن کے جو آیا تھا عَلم
جنگِ خیبر میں جو حیدرؑ نے اُٹھایا تھا عَلم
کربلا میں وہی عباسؑ نے پایا تھا عَلم

نامِ عباسؑ لئے فتح کا پیغام بڑھا
ہاتھ مولا کے کٹے، پرچمِ اسلام بڑھا

ذاتِ عادل کی عدالت کی نشانی ہے علَم

کارِ تبلیغِ نبوت کی نشانی ہے علَم

مرکزِ نورِ امامت کی نشانی ہے علَم

حق و انصاف و صداقت کی نشانی ہے علَم

جلوۂ طور پھریرے سے عیاں ہوتا ہے

لوحِ محفوظ کا پنجے پہ گماں ہوتا ہے

سطوتِ مذہبِ حقّہ کی نشانی ہے علَم
رفعتِ مذہبِ حقّہ کی نشانی ہے علَم
شوکتِ مذہبِ حقّہ کی نشانی ہے علَم
عظمتِ مذہبِ حقّہ کی نشانی ہے علَم

گوشے گوشے سے بصد جاہ و حشَم اٹھتا ہے
نامِ عباس کا دُنیا میں عَلم اٹھتا ہے

مرکزِ دولتِ ایماں کی علامت ہے، علَم

منبعِ چشمۂ عرفاں کی علامت ہے، علَم

سطوتِ حاملِ قرآں کی علامت ہے علَم

قوتِ شاہِ شہیداں کی علامت ہے علَم

دِل کے جذبات پھریرے سے عیاں ہیں اب تک

خونِ عباس کے چھینٹوں کے نشاں ہیں اب تک

مردِ مومن کے لئے باعثِ ایقان ہی علَم
منبعِ علم و یقیں، قوتِ ایمان ہی علَم
مظہرِ نورِ خُدا، مرکزِ عرفان ہی علَم
اہلِ دانش کے لئے فکر کا سامان ہی علَم

کربلا جبکہ تصوّر میں نظر آتی ہے
خشک مشکیزے کی تصویر اُبھر آتی ہے

موجۂ نورِ ہدیٰ، شہ کے علم کا سایہ

چشمۂ آبِ بقا، شہ کے علم کا سایہ

شاخِ طوبیٰ سی سوا شہ کے علم کا سایہ

سایۂ آلِ عبا، شہ کے علم کا سایہ

عہد و پیماں جو ہے حضرت سے وفاداری کا

کیسا روشن ہے نشاں شہ کی عزاداری کا

۳۰

باعثِ قوتِ ایمان عزاداری ہے

مردِ مومن کی رگ جان عزاداری ہے

قوم کی زیست کا سامان عزاداری ہے

فاطمہ بی بی کا ارمان عزاداری ہے

مرتبے بڑھتے ہیں شبیر کے غمخواروں کے

اشک رومال میں چنتی ہیں عزاداروں کے

غمِ شبیر میں مجلس جو بپا ہوتی ہے
موجبِ پیروی آلِ عبا ہوتی ہے
ذکر و اذکار سے معمور فضا ہوتی ہے
شاملِ حال شہیدوں کی دعا ہوتی ہے

زینبؑ عالیہ آتی ہیں حسینؑ آتے ہیں
اس میں شرکت کو رسول الثقلین آتے ہیں

رشکِ فردوس بریں فرشِ عزائے مجلس
اوجِ گردوں سے سوا اوجِ فضائے مجلس
حکمِ سرکارِ دوعالم ہے، بنائے مجلس
کم عبادت سے نہیں، شورِ نوائے مجلس

حق کی تائید جو ہے گریۂ پیہم کی صدا
قصرِ باطل کو ہلا دیتی ہے ماتم کی صدا

پھر سے مڑتا ہے سُوئے ذکرِ علمدار قلم
تا کہ کچھ کر سکے مولا کی شجاعت کو رقم
مدحِ عباس کی ہے، مدح شہنشاہِ اُمم
مَشعلِ راہ ہیں سقّائے سکینہ کے قدم

تذکرہ ہوتا ہے عباس کی غم خواری کا
ذِکر پھر چھڑتا ہے آئین وفاداری کا

ذکرِ عباسِ علیؑ جبکہ ہوا وردِ زباں

پھر گیا سامنے نظروں کے وغا کا میداں

ولولہ جوش و شجاعت کا تھا چہرے سے عیاں

موج زن دل میں تھا شمشیر زنی کا ارماں

شہ کا ادنیٰ سا اشارہ بھی اگر ہو جاتا

پھر یہ میدانِ وغا زیر و زبر ہو جاتا

کارِ تبلیغ امامت میں تھے مصروف امام
اپنے سینے سے لگائے ہوئے نانا کا پیام
ساتھ تھے حضرتِ عباس علی مثل غلام
سرِ تسلیم تھا خم پیشِ شہنشاہِ انام
حکم آقا کا بصد شوق بجا لاتے تھے
لاشے میداں سے شہیدوں کے اُٹھا لاتے تھے

یک بیک خیمے سے نکلی جو سکینہ معصوم

چار اطراف میں بی بی کے تھا بچّوں کا ہجوم

جان بلب پھرتے تھے اطفال حسینی مظلوم

بولے آقا سے یہ عباس بہ حالِ مغموم

دیکھی جاتی نہیں اب تشنہ دہانی آقا

کہئیے لے آؤں ابھی نہر سے پانی آقا

دی جو حضرت نے رضا، حق کا علمدار چلا

پانی لینے کے لئے، شہ کا وفادار چلا

سوئے میدانِ دغا، قاتلِ کفار چلا

غیر فرّار چلا، حیدرِ کرار چلا

ہوش منقق ہیں شجاعوں کے اُڑے جاتے ہیں

شور دریا پہ ہے، عباس علی آتے ہیں

کیا بیاں کوئی کرے دبدبہ و رعب و جلال

پیشِ عباس کوئی آئے یہ کس کی تھی مجال

جنگ ممکن تھی کہاں بھاگ کے جانا تھا محال

تھا فقط پیشِ نظر جان بچانے کا سوال

لی جگہ اپنی پسِ فوج جو سرداروں نے

راستہ دے دیا' دریا کا ستمگاروں نے

بیچ دریا کے جو سقائے سکینہ آیا

اہل باطل کو ندامت سے پسینہ آیا

بڑھ کے تعظیم کو موجوں کا سفینہ آیا

سر جھکائے ہوئے پانی کا خزینہ آیا

تھا علمدار جو مشکیزۂ معصوم لئے

بڑھ کے دریا نے عقیدت سے قدم چوم لئے

دیدۂ موج نے تلوؤں سے لگائیں آنکھیں
بڑھ گے گرداب نے قدموں میں بچھائیں آنکھیں
ابرِ باراں نے خجالت سے جھکائیں آنکھیں
مارے غیرت کے نہ دریا نے اُٹھائیں آنکھیں

سانس ٹھنڈی جو ستمگار کے لشکر نے بھری
مشک سوکھی ہوئی عباسِ دلاور نے بھری

بھر کے مشکیزہ بصد ناز علمدار چلا

آب رو بڑھ گئی، دریا سے وفادار چلا

تشنہ لب ساحلِ دریا سے جو اسوار چلا

گھونٹ پانی نہ پیا، پیاس میں سرشار چلا

عَلم پاک کو دریا میں جو لہرایا ہے

آج عباس نے غازی کا لقب پایا ہے

خوف سے فوجِ یزیدی پہ تھا سکتہ طاری

ہاتھ پیروں سے تھا، ہر اک کے پسینہ جاری

غرق تھی بحرِ خجالت میں سپاہ ناری

ایک عباس اکیلے تھے سبھوں پر بھاری

آتشِ بغض سے کفّار جلے جاتے تھے

شیر کی طرح سے عباس چلے جاتے تھے

یک بیک شمرِ بد اختر نے کیا بڑھ کے کلام

ہوش میں آؤ ذرا، اے سپہ کوفہ و شام

کر دیا تم نے شجاعانِ عرب کو بد نام

تنِ تنہا سے ہو مرعوب، ہے ذلت کا مقام

آن پہ حرف نہ اپنی کوئی آنے پائے

بچ کے عباس نہ میدان سے جانے پائے

سُن کے یہ بات ہوا سَن سے یزیدی لشکر
بن گیا قہرِ خُدا' فاتحِ خیبر کا پسر
تھے جو اسوار پراگندہ تو بیدل ابتر
مَرنے والوں کو نہ کُچھ موت کی ہوئی تھی خبر

جسم کہتا تھا کہ نیزے کی اَنی نے مارا
جان کہتی تھی کہ ہیرے کی کنی نے مارا

باوجودیکہ حفاظت کو تھا خالی نیزہ

زد پہ عباس کے آکر کوئی جیتا نہ بچا

لاش پہ لاش گری، بھر گیا میدان وغا

گرد عباس کے تھا خوں کا بہتا دریا

کھا کے نیزے کی انی گر کوئی بل کھاتا تھا

جان کے ساتھ کلیجہ بھی نکل آتا تھا

جنگ کے خوف سے تھی فوجِ یزیدی بے حال

دل شکستہ جو تھے اسوار تو پیدل تھے نڈھال

مرنا آسان نہ تھا، بھاگ کے جانا تھا محال

مُنہ پہ عباس کے آئے کوئی، کس کی تھی مجال

سرِ میدانِ وغا شہ کا علمدار بڑھا

زورِ باطل کا گھٹا، حق کا طلبگار بڑھا

ابتری دیکھ کے یہ شمرِ ستمگر نے کہا

چارہ کوئی نہیں اب پشت سے حملے کے سوا

وار تلوار کا حضرت پہ اچانک جو ہوا

تن سے بازو ہوا سقائے سکینہ کا جُدا

ہاتھ کٹ جانے سے نیزے کا سہارا ٹوٹا

غُل ملائک میں ہوا عرش کا تارا ٹوٹا

ناگہاں دوسرے بازو پہ بھی اک وار ہوا

ساتھ ہی ہو گیا ٹھنڈا عَلَمِ فوجِ خُدا

باوجود اس کے بھی سقائے سکینہ نہ تھما

ہاتھ کٹ جانے پہ مشکیزے کو دانتوں میں لیا

چار اطراف سے گو تیر چلے آتے تھے

صورتِ سرورِ رواں آپ چلے جاتے تھے

آکے ٹھہرے درِ خیمہ پہ امامِ مظلوم

دی یہ آواز کہ اے زینبؑ و امِ کلثومؑ

ہیں کہاں فضہؑ و رقیہؑ و سکینہؑ معصوم

بھائی کو دشت میں چھوڑ آیا حسینؑ مظلوم

میرے بھائی مرے غمخوار کا پُرسا دے دو

مجھ کو عباسِ علمدار کا پُرسا دے دو

ہائے پھر مشکِ سکینہ پہ جو اک تیر لگا
جُھک گئے گھوڑے پہ پانی کو بچانے مولا
یک بیک پشت سے اِک گُرزِ گراں بار اُٹھا
آسماں ٹوٹ پڑا، رن میں اندھیرا چھایا

خوں چہرے پہ جو روشن تھا وفاداری کا
خوب ماتھے پہ سجا تاج علمداری کا

دی علمدار نے آواز کہ یا شاہ انام
پہونچے عباس کا سرکار کی خدمت میں سلام
آخری وقت زیارت کو ترستا ہے غلام
خاک پر بیٹھ گئے سُن کے یہ آواز امام

پاؤں تھرائے، جگر تھام کے اُٹھا نہ گیا
تھا یہ صدمہ کہ کمر تھام کے اُٹھا نہ گیا

غمِ عباس سے گوشہ کا کلیجہ تھا فگار

یا علی کہہ کے اُٹھے خاک سے مولا یک بار

سُوئے دریا چلے کہتے ہوئے مرے غمخوار

دل میں ارمان وغا کے سدھارے ہیں نثار

تم کو شمشیر زنی کی جو اجازت ہوتی

اسی میداں میں قیامت پہ قیامت ہوتی

پاس عباس کے پہنچے جو شہنشاہ ھدیٰ
بھائی کو خون کے دریا میں تڑپتا پایا
منہ پہ منہ رکھ دیا، سرور کا عجب حال ہوا
شانے چومے کبھی جھک کر کبھی ماتھا چوما

فرطِ گریہ سے جو حضرت نہ سنبھل پاتے تھے
کہہ کے بھائی، کبھی بھائی سے لپٹ جاتے تھے

لے کے پھر گود میں سر بھائی کا سرور نے کہا

حق ادا کر دیا عباس وفاداری کا

ہاں مگر ایک ہے ارمان جو پورا نہ ہوا

بھائی مجھ کو نہ کہا، عمر بھر آقا کے سوا

اپنے بھائی کو کلیجے سے لگا لو عباس

آخری وقت مجھے بھائی پکارو عباس

بولے عباس کہ سو جان سے آقا پہ نثار

دلِ محزوں کو ہوا آپ کے آنے سے قرار

میں کہاں اور کہاں جانِ رسولِ مختار

ہاں مگر ایک تمنّا ہے، شہِ عرش وقار

میرا دُنیا سے گُذرنا بھی عبادت ہو جائے

آخری وقت جو حضرت کی زیارت ہو جائے

آکے پلکوں پہ جو ٹھہرا ہے لہو زخموں کا

کر نہیں سکتا میں حضرت کی زیارت آقا

بے بسی دیکھ کے عباس کی رو دیئے مولا

دامنِ پاک سے آنکھوں کا لہو پاک کیا

اپنے آقا کو بھی دیکھا تو نہ کچھ جان سکے

ہائے شبیرؑ کو عباسؑ نہ پہچان سکے

روکے یہ حضرت عباس نے سر ور سے کہا

مَیں ہوں شہزادی سکینہ سے بہت شرمندہ

پانی لانے کا جو وعدہ تھا وہ پُورا نہ ہوا

لاش خیمے میں نہ لے جائیں مری بہرِ خُدا

کہتے کہتے یہ سخن شہ سے سدھارے عباس

مومنو! ہو گئے اللہ کو پیارے عباس

ہائے شبیر پہ کیا ٹوٹ پڑا کوہِ الم
بھائی دیکھا کیا اور توڑ دیا بھائی نے دم
منتظر تھے شہِ والا کے جو خیمے میں حرم
لے کے مولا چلے عباس دلاور کا علم
راہ میں شدّتِ گریہ سے جو تھراتے تھے
یاد آتی تھی سکینہ تو سنبھل جاتے تھے

پہونچے خیمے کے قریں جبکہ شہ عرش مقام

دوڑی فضہ سرِ مقتل کہ نہ گر جائیں امام

جاتے جاتے یہ دیا حضرت زینب کو پیام

سرنگوں ہو گیا بی بی عَلَم شاہ اَنام

گود میں بالی سکینہ کو اٹھا لو بی بی

غم سے مر جائیں گے، بچوں کو سنبھالو بی بی

اے قلم صبر کہ ہوتا ہے کلیجہ پانی

تھم گئی طبعِ رسا، ختم ہوئی جولانی

بعد عباس ہے خیموں میں عجب ویرانی

بچّے خاموش ہیں، سہمی ہے سکینہؓ جانی

نہر پہ حضرت عباسؑ علیؑ سوتے ہیں

غم میں فرزند کے زہراؓ و علیؑ روتے ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسین

آج سے دو سال پہلے تک جو شاعر لکھنؤ کے خاص رنگ میں غزل کہتا تھا اور مشاعروں میں ترنم سے رنگ جماتا تھا۔ آج غزل سے جی چراتا ہے۔ غزل خوانوں کو مرثیہ لکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ عقبیٰ میں ملنے والی نعمتوں کی تحریص دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ مرثیہ کیوں نہیں کہتے۔ عاقبت مرثیہ کہنے سے سنور جاتی ہے؟ اس تحریک میں نہ کسی میر خلیق کا ہاتھ ہے نہ لکھنؤ کے حوصلہ پرور ماحول کا دخل ہے۔ یہ جذبہ خود آگہی کا ثمرہ ہے اس سے بڑھ کر خود آگہی اور کیا ہوگی کہ کوئی خود اپنے آپ اپنی راہ کا تعین کرے اور اُس راہ پر مستقل مزاجی سے ثابت قدم رہے اور عقیدے کے اس سفر میں اُس کا شعور پوری طرح اُس کا ساتھ دے۔

فکر کی یہ تبدیلی زندگی کے کسی بڑے انقلاب آفریں لمحے کا نتیجہ نہیں شعور کی رو سے اس کا تعلق ہو سکتا ہے۔ داخلی معاملات اور قلبی واردات کے اثر سے ایسے تغیرات اکثر ظہور میں آتے ہیں ممکن ہے۔ یہ انقلاب آغا صاحب کے کسی داخلی احساس کا رہین منت ہو۔ اس لئے قلب ماہیت کے اس مسئلہ کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتے ہیں اور اس موضوع کی طرف آتے

ہیں۔ جو سر دست اس بحث کا پیش خیمہ ہے۔

میں نہایت خوش قسمت ہوں۔ بلکہ ارجمند اور فرخندہ بخت بھی کہ مجھ فقیر کے خانۂ غریب پر ایک مجلس عزا میں حضرت مکرم جناب اسکندر مہدی آغا نے اپنا یہ مرثیہ نو تصنیف، بیاد شبیہہ پیغمبر حضرت علی اکبر عطا فرمایا۔ سامعین نے گوشِ حق نیوش سے سماعت کیا۔ بہاولپور کے اکثر اہل ذوق اس مجلس میں موجود تھے۔ سب نے پسند فرمایا۔ جناب آغا کا اردو ادب پر یہ بڑا کرم ہے کہ مرثیے کی حیات نو میں آپ نے بقدرِ ہمت بہ تمام و کمال حصہ لیا۔ اور بہاولپور کو کراچی پنڈی اور لاہور کے مماثل بنا دیا۔ ان بڑے شہروں میں کمالِ شاعری کی حوصلہ افزائی کے لئے ناظرین اور سامعین کی کثرت ہی کافی ہے۔ مستزاد اس پر اُن کی سخن فہمی بھی۔ مگر ایسے قریوں میں جیسے بہاولپور ہی جہاں تحت اللفظ خوانی اور مرثیہ نگاری کے لئے کوئی ہموار راستہ نہ ہو۔ مرثیہ لکھنا، مرثیہ پڑھنا، اور مرثیہ چھپوانا بڑی بات ہے۔ حضرت آغا نے (بقول کسے) یہاں کے لوگوں کو گھیر گھیر کے مجلس میں بلایا ہے۔ اور بار بار کے مرثیہ سُنایا ہے۔ تب کہیں جاکر ایک ماحول بنا ہے۔ اور ایسا بنا ہے۔ کہ شاید مشکل سے بگڑے۔ جناب اعز ازشتر لکھنوی نے بھی مرثیہ کہہ لیا۔ جناب شہاب دہلوی نے بھی اس منبر پر مرثیہ خوانی کر لی۔ کچھ اور بھی اپنے بستے تیار کر رہے ہیں۔ یہ رنگ ابھی اور جمے گا گھر ٹوٹا بھی بڑی دیر میں اور بڑی مشکل سے ٹوٹے گا میرا

جی کہتا ہے۔ کہ کوئی لکھے یا نہ لکھے۔ جناب شہاب دہلوی سال کے سال ضرور مرثیہ کہہ لیا کریں گے۔

آغا صاحب نے ایک سال میں پانچ مرثیے کہہ لئے۔ دو ماہ قبل جب میں گرمیوں کی چھٹی میں لاہور جا رہا تھا۔ ان کے تازہ مرثیے کا یہ مصرعہ ؏

اور ایک سال میں چوتھا یہ مرثیہ لکھا

بستر علالت پر اُن سے یہ سُن کے گیا تھا۔ اب جو واپس لوٹا ہوں تو سُنتا ہوں کہ وہ پانچواں مرثیہ مکمل کر رہے ہیں۔ یہ خبر سُن کر خوشی سے متحیر ہوتا ہوں۔ یہ بستر علالت بھی خوب تھا مفکروں اور فلسفیوں کی زندگیوں میں قید و بند اور تنہائی کی حالتوں نے فکر و فلسفہ کو اور زیادہ مہمیز دی ہے۔ زنداں میں جو شعر و حکمت اور فکر و فن نے پرورش پائی ہے۔ غالباً اُس کی وجہ یکسوئی اور علائق دنیا سے فرصت ہے تخلیق کے لئے ایک مستقل خاموشی کی ضرورت ہے جو اس ماحول میں میسر آجاتی ہے۔ آغا کی بیماری اور پندرہ دن تک ہسپتال میں (Bed - Confinement) "بستر بند" حالت نے ہمیں ایک نیا مرثیہ دیدیا۔ یہی وہ مرثیہ ہے۔ جو آپ اب پڑھیں گے

سرکار شباب جناب علی اکبر کے حال میں مرثیہ نگاروں نے لاتعداد مرثیے لکھے ہیں۔ اس اقلیم سخن کے تاجدار میر انیس اور اُن کے حریف معاصرین نے متعدد مرثیوں میں شہزادہ علی اکبر کا حال لکھا

ہے۔ اس شہزادہ کا کردار واقعہ کربلا میں ایک نمایاں کردار ہے۔ اُس کا تاثر دوسرے کئی کرداروں سے زیادہ ہے۔ اس لئے یہ زیادہ محرک بھی ہے حضرت علی اکبر سے امام حسین علیہ السلام اور جناب زینب سلام اللہ علیہا کو شدید محبت تھی۔ آپ کا بھرپور شباب تھا۔ ماں باپ بہن بھائیوں کی آرزو تھے۔ آپ شکل و صورت میں رسولِ خُدا سے مشابہ تھے۔ آپ میدان جنگ میں جب گئے۔ ایک شکست صبر کا سا عالم پیدا کر گئے۔ آپ رخصت جس طرح ہوئے۔ نثار ہو کر جس طرح آئے۔ آپ کا خیام اہل بیت میں جس طرح ماتم ہوا۔ یہ سب کوائف ایسے ہیں۔ جن سے المیہ جذبات میں نہایت سرعت سے تحریک ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں لازم تھا۔ کہ مرثیہ میں بُکا شروع ہو جاتی اور بین ہوتا۔ مگر ترکیب فن کرنے والوں نے مرثیے کے اجزائے ترکیبی مقرر کر دیئے۔ ان اجزا سے گذر کر بین تک پہنچنا لازم ہوا مگر ان اجزائے سے جو مرثیہ گذر جائے۔ پُرانے خیال کے اہل علم کے مطابق وہ مرثیہ ہے۔ ورنہ مسدس۔ مگر میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ترکیبی کی پابندی ایسے عقلاً اور حکمائے عصر پر کہ ان سے ہر ایک اپنے فن کا منتہی بھی ہو۔ لازم نہیں آتی۔ جیسے اُن سے پہلوں نے اپنے بلند رتبے، اپنے اختیار فن اور مشق سخن سے فائدہ اٹھا کر کچھ نئے اصول وضع کئے۔ ایسے ہی انہیں یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ یہ بھی اپنا راستہ بنائیں۔ اور تجدد اور تخیل کے الزام میں اُن مجددوں کو صنف سخن کے احاطے سے باہر نہیں نکال دینا چاہیئے۔ اگر ایسا ہوا۔ مسدس اور

یہاں اُس کی آمد دکھائی جاتی ہے۔شکل و صورت کا بیان ہوتا ہے
اس کے خد و خال کی تعریف کی جاتی ہے۔ یہ مقام سراپا کہلاتا ہے
اِس جگہ سے شخصیت آہستہ آہستہ طلب جہاد کی طرف آتی ہے
سُوئے مقتل جاتی ہے۔ دشمنوں کو للکارتی ہے۔ اس حالت میں مکالمے اور
مخاطبے ہوتے ہیں۔ یہ منزل رجز کہلاتی ہے۔ رجز کے بعد جنگ ہوتی ہے
جنگ کے بعد شہادت۔ شہادت کے بعد بین اور بُکا۔ دعا اور
خاتمے کی منزل آتی ہے۔ اس مرثیہ کا چہرہ اردو کے بعض شہرت
یافتہ مرثیوں کے چہروں سے کسی طرح کم نہیں۔ چہرے کی زبان عام طور پر
بہاریہ اسلوب اور ساقی نامے کے مضامین کے قریب قریب رہتی
ہے۔ تعلّی کی مضامین اور جمالیاتی اسلوب سے اس خاکے میں اور
جان پڑتی ہے۔ اس میں مضامین محدود نہیں ہوتے۔ مرثیے کے پیش لفظ
کی صورت میں نوع بہ نوع پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ چہرہ ایک طرح
سے مرثیے کا مقدمہ ہوتا ہے۔ جو علم معانی و بیان کی خوبیوں کو پیش نظر
رکھ کر لکھا جاتا ہے۔ بایں سبب مرثیے کا چہرہ شاعری کا زرد مال
کہلاتا ہے "شبیہہ پیغمبر" کا چہرہ ان خصوصیات کے اعتبار سے مثالی
ہے۔ مرثیے کے چار اجزا۔ چہرہ۔ سراپا۔ رجز اور جنگ شاعرانہ
خوبیوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ان زور بیان تشبیہات میں شوکت الفاظ
ولطفِ معانی کا تمام تر حُسن سمٹ آتا ہے۔ آغا کے چاروں مرثیے
میں نے دیکھے ہیں۔ باقی تینوں مرثیوں اور اس مرثیے کے اجزائے

ترکیبیں نہایت درجہ کمال خوبی سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ اس مرثیے کے سراپا میں بھی ایک عمدگی ہے کہ وہ مختصر ہے اور مکمل ہے ایجاز بیان کی عمدگی سے صرف تین بندوں میں شہزادہ علی اکبر کے حسن کی تصویر کھنچ آئی ہے۔ البتہ رجز کے مقام پر شاعر خاموش رہا ہے۔ یہ خاموشی بے سبب معلوم ہوتی ہے اور اس کی جولانی طبعی کے خلاف بھی ہے۔ سراپا سے جنگ کے مناظر کی طرف منتقل ہوتے ہوئے، رجز کے مضامین، جو روایتی مرثیے کی شاندار روایت ہیں۔ شاعر نے نہیں باندھے۔ مگر قطع نظر اس پہلو کے "شبیہ پیغمبر" اس مقررہ ہئیت میں ایک مثالی مرثیہ ہے۔ اس کی زبان خاص، مرثیے کی زبان ہے۔ مرثیے کی زبان لکھنا آسان کام نہیں۔ بڑی مشق و ممارست کی ضرورت ہے۔ اس کیلئے وسیع مطالعہ اور طویل تجربہ چاہیئے ہے۔ مثنوی کا حسن بیان، قصیدے کی شان و شوکت غزل کا علامتی لب و لہجہ۔ واسوخت کا تیکھاپن سب اسلوب سمٹ کر ایک CANVASS پر ابھر آئیں۔ تب کہیں مرثیے کی مخصوص زبان ترکیب پاتی ہے۔ ایسی زبان کے استعمال میں ایک نازک مرحلہ یہ ہے کہ بیان میں ہلکاپن کہیں پیدا نہ ہو۔ اور مرثیے کے واقعے سے جو تصور بلند اور تقدس وابستہ ہے۔ اُس میں کسی ایک حرف سے بھی کمی نہ آجائے۔ یہ احتیاط اور ضبط الفاظ شاعر کا بڑا کارنامہ ہے۔ اور یہ اُس وقت ممکن

ہے. جب اُس نے قدیم و جدید مرثیے کو اچھی طرح پڑھا ہو۔

مرثیہ نفسیاتِ انسانی کا ایک نادر مرقع ہے۔ اس کے مذکورہ واقعات کا انسان کے جذباتی ماحول سے مضبوط تعلق ہے۔ اس تعلق کو برقرار رکھنے کے لئے انسان کے جذباتی فلسفے کو اچھی طرح سمجھنا لازم ہے۔ خاص طور پر ایسے واقعات کو جیسے اس مرثیے میں نظم کئے گئے ہیں یا جیسے عام طور پر حضرت علی اکبر کے حال کے مرثیوں میں پیش آتے ہیں۔ خوب اچھی طرح سمجھنا پڑتا ہے. شاید اس بنا پر بعض اہل قدر یہ کہتے ہیں۔ کہ مرثیہ لکھنا آسان نہیں آغا اسکندر مہدی نے اس مشکل کو جس طرح آسان کیا ہے. یہ اُن کے افتیارِ فن کی ایک واضح دلیل ہے۔

غزل، قصیدہ، نظم یا دوسری اصناف سخن خارجی تحریک کے تحت بھی لکھی جاتی ہیں اور لکھی گئی ہیں۔ مگر مرثیہ ایسی صنف سخن ہے۔ جس کے لئے داخلی تحریک ازبس ضروری ہے، یہ تحریک اس مشقت اور ریاضت کو سہل بنا دیتی ہے. جو اس صنف سُخن کی ترکیب میں پیش آتی ہے۔ اس مرثیہ میں آپ موضوع کے ساتھ فنکار کی مکمل یکسوئی اور وابستگی محسوس کریں گے۔ جس کے نتیجے میں کسی جگہ یا کسی مقام پر ربط معانی، فکری تسلسل اور ابلاغ میں الجھاؤ پیدا نہیں ہوا. یہ کارنامہ اخلاص عمل اور حُسن نیت کا مظہر ہے۔ داخلی عوامل

مرثیہ علیحدہ کر دیا گیا۔ تو مرثیے کو نقصان پہنچے گا۔ اور مرثیے کے نادان دوست اس کے ساتھ تنہا رہ جائیں گے۔ خود مرثیے کے مسدس ہونے کو لیجئے۔

سودا سے پہلے دو سال تک اردو میں مرثیہ اور واقعات کربلا کی نظمیں مستقل لکھی گئیں۔ سودا نے ہیت سے انحراف کیا۔ سوداؔ کے اس مروج ہیت سے انحراف کو تسلیم کر لیا جائے اور نہ صرف تسلیم کر لیا جائے بلکہ اُسے مثال سمجھا جائے۔ مگر سودا سے انحراف کو جُرم سمجھا جائے، کہاں کی دانائی ہے؟ میں یہ مانتا ہوں۔ کہ مخصوص ہئیت ترکیبی سے جو مرثیہ بنا ہے، وہ ایک آرٹ ہے۔ اور آرٹ ہمیشہ بد نظمی، انتشار اور فکری افراتفری کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس میں ترکیب اور ترتیب سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ خاص طور پر مرثیے کی ہیت تو نہایت عمدہ اور موثر ہے۔ خود آغا صاحب کے مرثیہ کو لے لیجیئے۔ اس میں اس ترکیب سے کتنا حُسنِ تناسب پیدا ہو گیا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے۔ کہ اس میں نہایت احتیاط سے اجزائے ترکیبی کا خیال رکھا گیا ہے۔ پہلے چہرہ ہے۔ چہرے میں مرثیہ کی ابتدا ہوتی ہے اور آئندہ آنے والے مضامین کی فکری بنیاد قائم کی جاتی ہے۔ اس منزل میں افتادِ طبع زورِ قلم جمالِ فکر اور ارادہ نظم کے مضامین لائے جاتے ہیں۔ پھر گریز کرتے ہوئے ایسی منزل پر مضمون آجاتا ہے۔ جہاں ایک شخصیت ابھرتی ہے

اس کے بالکل واضح ہیں۔ شاعر نے زندگی کی بے ثباتی کو دو پیہم
حادثوں سے اور زیادہ محسوس کیا ہے۔ یہ دونوں حادثے جاں کاہ
ہیں۔ ایک ان میں شدید محبت رکھنے والی ماں کی موت کا صدمہ
ہے۔ دوسرا ہم قالب و ہم جاں۔ دلدار بہن کی موت کا سانحہ
ہے۔ بالخصوص یہ مرثیہ جو آپ کے پیش نظر ہے مرحوم بہن کے
ایصال ثواب کے لئے لکھا گیا ہے۔ مرثیہ کے جس ماحول میں ہم
سب نے پرورش پائی ہے اور شاعر جس تہذیبی ماحول میں رہا ہے
اس کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنا غم بھول جائیں۔ حسین اور
انصار حسین کا غم کریں۔ اس غم کے اظہار اور اس پر بین کی
ہمارے المیہ جذبات کو جو سکون ملے۔ اور ہمیں شرح صدر
حاصل ہو۔ وہی ہمارے ذاتی غم کا مداوا بن جائے۔

ڈاکٹر سید اسد اریب
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
۱۲ ستمبر ۱۹۶۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مطلع

ہے آج پھر قلم نکتہ رس وقارِ سخن

نسیمِ فکر کے جھونکوں میں ہے بہارِ سخن

اُڑا ہے رخشِ تخیُّل پہ شہسوارِ سخن

خراج لے گا زمانے سے تاجدارِ سخن

چلا ہے پرچمِ دینِ مبین اُڑائے ہوئے

بصد ادب ہیں مضامین سر جھکائے ہوئے

۲

درست کی ہے جو الفاظ نے صفِ تنظیم
محاورات بھی حاضر ہوئے پئے تعظیم
اشارے کر کے کنائے بھی ہو چکے ہیں مقیم
اور استعارے بھی موجود ہیں بہ قلبِ صمیم

دریچہ وا، جو ہوا ہے، کلامِ مُجمل کا
کُھلا ہے بابِ حقیقت، مجازِ مرسل کا

ادھر قلم بھی بصد ناز و عز و جاہ چلا
اُٹھا یہ شور کہ اقلیمِ فن کا شاہ چلا
برائے فکر و تجسس فلک نگاہ چلا
قدم قدم پہ جلاتا چراغِ راہ چلا

قلم کہ شاخِ ثمردار کا نمونہ ہے
جو نقش ہے خطِ گلزار کا نمونہ ہے

چمک رہا ہے جو قرطاس کا خطِ تقدیر

فرازِ عرش پہ لرزاں ہے حسنِ بدرِ منیر

کھنچے گی عکسِ خیالات کی نئی تصویر

کہ آج سر پہ ہے پھر سایۂ جنابِ امیر

اُفق سے تا بہ اُفق ہے فضائے ایمانی

علیؓ کی ذات ہے وجہِ ضیائے ایمانی

۵

متاعِ نوعِ بشر ہے ضیائے ایمانی
جمالِ نورِ سحر ہے ضیائے ایمانی
سرورِ دردِ جگر ہے ضیائے ایمانی
شعاعِ حسنِ نظر ہے ضیائے ایمانی

اسی سے جلوہ بداماں ہے داستانِ حیات
رواں دواں ہے زمانے میں کاروانِ حیات

یہی ہے لغزشِ آدم کا اصل کفارہ
سیاہ خانۂ دنیا میں نور کا دھارا
ہے سالکانِ وفا کیلئے قطب تارا
چراغِ راہ گذر، روشنی کا مینارا
فضائے دہر میں سورج نیا اُبھرتا ہے
اسی سے رنگِ رُخِ زندگی نکھرتا ہے

۷

اسی سے ہوتی ہے تطہیرِ روحِ انسانی

اسی سے ہوتی ہے ذہنِ رسا کی جولانی

اسی سے ہوتی ہے تحقیرِ زعمِ سُلطانی

اسی سے ہوتی ہے تفسیرِ حُکمِ ربّانی

یہ بے دھڑک سرِ دربار ٹوک دیتی ہے

انانیت کے سمندر کو روک دیتی ہے

۸

اسی سے کھلتے ہیں عالم پہ وصفِ انسانی

اسی کے نور سے روشن بشر کی پیشانی

اسی سے کرتا ہے مومن دلوں پہ سلطانی

اسی سے جاتی ہے قلب و نظر کی ویرانی

بنا ہے طورِ دلِ داغدارِ آدم کا

اسی کے دم سے ہے قائم وقارِ آدم کا

یہی بنا گئی مسلماں کو صاحبِ کردار
اسی کے دم سے تھی بوذرؓ میں گرمیٔ گفتار
یہی تھی باعثِ توقیر میثمِ تمار
اسی کے نور کے حامل تھے حضرتِ عمار

یہ وہ ہیں جن پہ صداقت کو ناز ہے اب تک
عمل پہ جن کے شہادت کو ناز ہے اب تک

یہی وہ تھے کہ بنا جن سے قوم کا کردار
جُھکا سکی نہ جنہیں ظلم و جور کی تلوار
تھے خاک اُن کی نگاہوں میں درہم و دینار
انہیں کے خوف سے اہلِ دوّل تھے سینہ فگار

سروں کا بار جو بنتا تھا تاج شاہوں کا
غرور خاک میں ملتا تھا کج کلاہوں کا

بنا دیا انہیں عزم و یقین نے لافانی

بجا ہے ان کو کہیں فخرِ نوعِ انسانی،

متاعِ دیں سے جو قلب و نظر تھے نورانی

زبان تھی اُن کی کلیدِ رموزِ قرآنی

جہاں بھی جاتے تھے جب بھی کلام کرتے تھے

یہ ذکرِ آلِ محمدؐ کو عام کرتے تھے

ہمیشہ رہتے تھے عشقِ رسول میں سرشار
زباں پہ رہتی تھی توصیف حیدرِ کرار
کبھی جو پڑ گئی اُن کی نگاہ آتش بار
بدل کے رہ گئی شاہانِ وقت کی رفتار
کوئی شہید ہوا، کوئی سوئے دار بڑھا
انہیں کے ساتھ میں اسلام کا وقار بڑھا

مجھے بھی خالقِ یکتا نے یہ شرف بخشا

کہ دل میں ولولۂ مدحِ اہلبیت اُٹھا

سرور و کیف کی چھانے لگی جہاں پہ فضا

فلک سے رحمتِ حق کا نزول ہونے لگا

قلم کا زور بڑھا، فکر نے جِلا پائی

صریرِ خامہ سے آوازِ ھل اتیٰ آئی

پڑی جو گلشنِ مداحِ اہلِ حق پہ نظر
چمک رہے تھے مضامین نو کے لعل و گہر
کمالِ حسنِ تخیّل تھا ماورائے بشر
کُھلا تھا معنئ علمِ بیاں کا دفتر
خُدا کا فضل تھا، تائید آسمانی تھی
ہر ایک سمت مودت کی ضو فشانی تھی

یہ بات دیکھ کے میں نے بھی کی خدا سے دُعا
حضورِ پاک کا صدقہ مجھے بھی کچھ ہو عطا
خلوصِ دل سے تھا کہنا، مرا قبول ہوا
پلا دیا مرے ساقی نے مجھ کو جامِ وِلا

سرورِ ساغرِ تسنیم رنگ لاتا ہے
قلم کی نوک پہ مضمون کھِے آتا ہے

مرے قلم نے جو تائید ایزدی پائی
جُھکا کے سر کو بڑھا حُسن چرخ مینائی
شعاعِ شمس و قمر ہاتھ باندھ کر آئی
فضا نے پیش کی قوسِ قزح کی رعنائی
حنا کا رنگ جو حورِ شفق نے عام کیا
صبا نے بڑھ کے ادب سے مجھے سلام کیا

مہکتی آئی چمن سے گلاب کی خوشبو
نظر کا نُور لئے آئی نرگسِ جادو
جگر کا خون لئے آیا لالۂ خوشرو
بہار طشت میں لائی گلوں کے جام و سبو
وِلائے آلِ محمدؐ کا جب خُمار بڑھا
تو جھومتا ہوا گلشن سے سبزہ زار بڑھا

بھری تھی کیف سے ہر سو فضائے مستانہ

چھلک رہا تھا مودّت سے دل کا پیمانہ

ولائے آلِ محمدؐ سے پُر تھا میخانہ

کسی کی طرف سے یہ آئی صدائے رندانہ

بہارِ گلشنِ ایمان یا علیؑ حیدر

دیارِ حق کے نگہبان یا علیؑ حیدر

عجیب جوشِ عقیدت نے رنگ دکھلایا
علی کے نام نے مجلس کو خوب گرمایا
زباں پہ جذبۂ دل یک بیک اُبھر آیا
کیا وہ کام، عبادت کا مرتبہ پایا

فروعِ دیں سے ہیں افضل اُصُول کی باتیں
خُدا کا ذکر ہے نفسِ رسول کی باتیں

اِدھر قلم نے بھی دکھلائی خوب جولانی
اُدق رہے نہ مضامیں ہو گئے پانی
چمک رہی تھی جو نورِ وِلا سے پیشانی
کچھ اور بڑھ گئی تقدیسِ مرثیہ خوانی
شعاعِ مہر کا دامن نچوڑ کر لایا
یہ آسماں سے تاروں کو توڑ کر لایا

بیان جب کئے اُس نے رمُوزِ قرآنی
تو دنگ رہ گئی عقلِ رسائے انسانی
مفسروں کو تھی تفسیر پر پریشانی
عرق عرق تھی ندامت سے انکی پیشانی

قیاس نے انہیں تاریکیوں میں ڈالا تھا
قلم کا فیض امامت سے بول بالا تھا

لکھی جو حمدِ خداوند قادرِ مطلق

تو یاد آ گیا یکتائیِ خدا کا سبق

رسولِ پاک کی تخلیق کا کھلا جو ورق

حدیثِ نور سے روشن ہوئے دلوں کے طبق

حضور نقطۂ انجام ہیں رسالت کا

کہ جن کے بعد چلا سلسلہ امامت کا

بقائے حق کے لئے شرط ہے وجودِ امام
کہ برقرار رہے تا بہ حشر حق کا پیام
جو یہ نہیں تو شبِ قدر کا کہاں ہے مقام
فرشتے لاتے ہیں کس کی طرف پیام و سلام؟
زمیں رہے گی نہ حق کے پیام سے خالی
کبھی نہ ہوگا زمانہ امام سے خالی

امام حُجّتِ حق ہے، امام نورِ مبیں

امام رحمتِ یزداں، امام نیرِ دیں

امام رہبرِ کامل، امام صُبحِ یقیں

امام، سارا زمانہ ہے جس کے زیرِ نگیں

امام، شر سے شیاطین کے بچاتا ہے

جو پیروی کرے اُس کی نجات پاتا ہے

امامِ وقت نے مجھ کو بھی آگہی بخشی
کمالِ لطف سے ذرے کو روشنی بخشی
سکونِ قلب دیا، روح کو خوشی بخشی
کلام کو مرے پھولوں کی تازگی بخشی

زبان کے تار میں لعل و گہر پروتا ہوں
دلا کے ہار میں شمس و قمر پروتا ہوں

غرور کچھ نہیں اپنی سُخنوری کا مجُھے
مگر دیا ہے صلہ مدح گستری کا مجھے
ملا ہے بخت جو شاہانِ حیدری کا مجھے
خیال آتا ہے گردوں سے ہمسری کا مجھے

سند کے واسطے کیا رتبہ قبُول ملا
کرم سے شہ کے مجُھے منبرِ رسُول ملا

عروج اس کے سوا ؔ اور مجھ کو کیا ہو گا
کہ ایک سال میں چوتھا یہ مرثیہ لکھا
سبھوں کے سامنے منبر پہ ہیں بلند ہوا
بنا ہے تاج مرے سر کا پرچمِ مولا
جہاں میں دولتِ عقبیٰ کی فکر کرتا ہوں
شہادتِ علیؑ اکبر کا ذکر کرتا ہوں

بہارِ گلشنِ شبیر ہیں علی اکبر

حَسَن کے حُسن کی تنویر ہیں علی اکبر

علی کے نام کی تفسیر ہیں علی اکبر

رسولِ پاک کی تصویر ہیں علی اکبر

بلائیں لینے کو حوروں کے ہاتھ بڑھتے ہیں

وہ نُور ہے کہ فرشتے درود پڑھتے ہیں

مثالِ نیّرِ تاباں ہے چہرۂ انور

ہلال ابرو خمدار وجہ نور قمر

جمال ایسا کہ خیرہ نگاہ بد اختر

جلال ایسا کہ جلنے لگے عدو کی نظر

انہیں کے دم سے محمدؐ کے گھر اجالا ہے

جنابِ ثانیؑ زہراؑ نے اُن کو پالا ہے

ہیں شرح آیۂ واللیل گیسوئے خمدار
کمالِ لعلِ بدخشاں ہیں نقرئی رخسار
جوابِ نغمۂ داؤد ہیں لبِ گفتار
مثالِ یوسفِ کنعاں ہیں صاحبِ کردار
ریاضِ فاطمۂ زہرا کے گُلعذار ہیں یہ
صفاتِ آلِ محمدؐ کے ورثہ دار ہیں یہ

چلی جو بادِ مخالف بروزِ عاشورا

چراغِ حق کو بجھانے اُٹھے امام ھدیٰ

ہر اک سمت سے باطل نے سر اُٹھایا تھا

مگر تھا دیں کی سپر نورِ عین حیدرؑ کا

جواں بیٹے کو برچھی جگر پہ کھانے دی

مگر نہ دینِ محمّد پہ آنچ آنے دی

حسینؑ ساتھ میں لائے تھے منفرد لشکر
جواب جس کا نہیں ہے بساطِ ہستی پر
کمالِ حُسنِ تدبر تھا انتخابِ نظر
صفِ جہاد میں شامل تھا شیر خوار بھی سپر
عدو بھی رو دیئے سوکھی زباں دکھانے پر
صفیں اُلٹ گئیں اصغرؑ کے تیر کھانے پر

جہاد ایسا نہ چشمِ فلک نے دیکھا تھا
کہ امتیاز مٹا تھا غلام و آقا کا
پلٹ کے رکھ دیا ہر اک نے جنگ کا نقشا
لہو سے سُرخ ہوا ریگ زارِ کرب و بلا
رہِ جہاد میں دینِ مُبیں پہ مرتے تھے
یہ حق پرست تمنائے موت کرتے تھے

تمام ہو گیا جب دم حسینؑ کا لشکر
شہید ہو گئے انصار باوفا حق پر
اجل نے لوٹ لیا باغِ سبط پیغمبر
رہا نہ کوئی بھی باقی بجز علی اکبر

سوئے پدر پسر خوشخصال نے دیکھا
پسر کی شکل کو زہرا کے لال نے دیکھا

کہا حسین نے اکبر تمہیں ہے اذن وغا

کیا تھا میں نے جو وعدہ وہ ہو گیا پورا

تمہارے خون سے نکھریگا رنگ حُسنِ وفا

علی کا لال محمدؐ سے سُرخ رو ہوگا

رکاب تھام کے ہلکا غموں کا بار کیا

حسینؑ نے علی اکبر کو خود سوار کیا

ادب سے گھوڑے پہ جونہی بڑھا جب ان کا پسر

کمر کو تھام کے خود ساتھ ہو لئے سرور

یہ کہتے جاتے تھے آہستہ اے علی اکبر

پدر نثار تمہارے شبیہ پیغمبر

تمہاری شکل سے نانا کی یاد آتی ہے

رسولِ پاک کی تصویر ان کو جاتی ہے

یہ کہہ کے دیکھا جو حضرت نے سوئے لختِ جگر

تو سر کو پاسِ اَدب سے جُھکائے تھے اکبر

فرس رکا تھا، قدم تھے رکاب سے باہر

یہ حال دیکھ کے بیتاب ہو گئے سرور

کہا حسینؑ نے لختِ جگر خُدا حافظ

ضعیف باپ کے نُورِ نظر خُدا حافظ

برائے جنگ جو وہ صاحب کمال بڑھا

اٹھا یہ شور کہ خیبر کشا کا لال بڑھا

مثالِ نُور مبیں حُسن لازوال بڑھا

جلال آیا تو کچھ اور بھی جمال بڑھا

اُٹھا یہ غل کہ ہٹو قلعہ گیر آتے ہیں

قیامت آئی جناب امیر آتے ہیں

فرس اڑا کے جو اکبر چلے سوئے مقتل
در آیا فوجِ عدو میں سوار رخشِ اجل
سمند کانپتے، سواروں مچ گئی ہلچل
لرز کے رہ گئے آگے نہ بڑھ سکے پیدل
سموں میں گھوڑوں کے پنہاں نشان شاہی تھے
قدم جو تھم گئے مُلکِ عدم کے راہی تھے

صفوں میں فوج مخالف کے تھی پریشانی

ملا تھا خاک میں زعم و غرورِ سلطانی

لہو سے سرخ تھا، نہر فرات کا پانی

بنا تھا قہر الٰہی حسینؑ کا جانی

غضب خدا کا تھا، سیل رواں گذرتا تھا

لہو میں ڈوب کے دشمن کا سر ابھرتا تھا

جہاد کے لئے جس سمت بھی بڑھے اکبر

صفیں اُلٹ گئیں، بھاگا یزید کا لشکر

کوئی یہ کہتا تھا آتے ہیں حمزہ و جعفر

گماں تھا اس کا کہ لڑتے ہیں حیدرِ صفدر

ملا نہ وقت لعینوں کو سر اُٹھانے کا

بُلند نام کیا ہاشمی گھرانے کا

دُعائیں کرتے تھے بچنے کی سب صغیر و کبیر
وہ خوف تھا کہ غلاموں میں چھپ گئے تھے امیر
بچاؤ کی نہ مؤثر ہوئی کوئی تدبیر
عقب سے دفعتاً آیا حصین ابن نمیر

دلِ حسینؑ پہ ظالم نے آکے وار کیا
سپر کی آڑ سے نیزہ جگر کے پار کیا

لگا جو سینے میں نیزا بصد فریب و ریا

جری نے غیظ سے نیزے پہ ہاتھ ڈال دیا

بس ایک جھٹکے سے برچھی کے پھل کو توڑ لیا

نہ جان جانے کا اکبر نے کچھ خیال کیا

لگی جو پیاس تو ہاتھوں سے دل کو تھام لیا

بڑھا جو درد تو مُشکل کُشا کا نام لیا

حسینؑ دیکھ رہے تھے جہادِ اکبر کا

کہ ناگہاں نظر آیا نہ شہ کو ماہ لقا

سمجھ گئے کہ فدا ہو گیا جواں بیٹا

بھر آئے آنکھ میں آنسو جگر میں درد اٹھا

کمالِ صبر دکھانے ضعیف باپ چلا

جواں کی لاش اٹھانے ضعیف باپ چلا

فضا خموش تھی دلدوز تھا عجب منظر

عدو کے نرغے میں مولا کو تھی تلاش پسر

گئے حسینؑ کئی مرتبہ اِدھر سے اُدھر

پکارتے تھے کہ آواز دو علی اکبر

غبار نے مرے نورِ نظر کو گھیرا ہے

جواب دو علی اکبر بڑا اندھیرا ہے

اِدھر حسینؑ کو تھی آرزوئے دیدِ پسر
اُدھر تھا فوجِ مخالف کا کچھ عجب منظر
تھما تھا کہہ کے یہ ہر سو یزید کا لشکر
کہ آج دیکھیں گے ہم صبرِ سبطِ پیغمبر
جگر کو تھامیں گے یا قلب کو سنبھالیں گے
حسینؑ کس طرح برچھی کا پھل نکالیں گے

سرہانے جب علی اکبر کے شاہِ دیں آئے
کلیجہ کانپ گیا ہاتھ پانْوں تھرّائے
خُدا نہ داغِ پسر دشمنوں کو دکھلائے
ضعیف باپ نہ بیٹے کی لاش پر جائے

مگر حُسینؑ نے وہ کارِ بے مثال کیا
جگر سے بیٹے کے برچھی پھل نکال لیا

کھلا جو زخم تو بہنے لگا جگر کا لہو
اُٹھا وہ درد کہ تھرّا ائے اکبر مہرد
چراغ گُل ہوا گُل سے نکل گئی خوشبو
حسینؑ رو نہ سکے خشک ہو گئے آنسو

ضعیف باپ پہ کیسا فلک نے غم توڑا
عدو بھی رو دیئے جب نوجواں نے دم توڑا

چلے حسینؑ جو مقتل سے لے کے لاش پسر
خدا کی راہ میں لختِ جگر تھا ہاتھوں پر
پکاری دیکھ یہ حال زینبؑ مضطر
مدد کو آئیے للہ حیدرِ صفدر
پسر کی لاش ہے عجلت سے کام لو بابا
حسینؑ سے علی اکبر کو تھام لو بابا

اِدھر یہ حال تھا خیمے میں اُمِّ لیلیٰ کا
رواں تھا بی بی کے آنکھوں سے خُون کا دریا
جگر کو تھام کے فضہ سے یہ سوال کیا
پسر کی لاش کو لے آئے کیا شہ والا
میں اپنے چاند سے گبھرو جواں کو دیکھونگی
لگی کہاں پہ ہے برچھی نشاں کو دیکھونگی

ابھی یہ بات کہی تھی کہ ایک شور اُٹھا

کہ لاش خیمے میں لاتے ہیں سیّد والا

عبا تھی سُرخ لہو سے تو زرد تھا چہرہ

زمیں پہ رکھ دیا لاشہ، زباں سے کچھ نہ کہا

پسر کا داغ ہے کس طرح دل کو کل آئے

حسینؑ خیمے سے روتے ہوئے نکل آئے

بس اے قلم کہ کلیجہ فگار ہوتا ہے

شکستہ غم سے دل بیقرار ہوتا ہے

نڈھال ابنِ شہ ذوالفقار ہوتا ہے

ہر ایک اہل عزا اشکبار ہوتا ہے

ضریح چوم کے منت بڑھائی جاتی ہے

زیارت علی اکبر پڑھائی جاتی ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"فیصلہ حُر کا طمانچہ تھا بہ رُخسار یزید"

آغا

مرثیہ، عربی، فارسی و اردو ہی میں نہیں بلکہ ہماری مقامی زبانوں میں بھی اعلیٰ درجہ کی صنف شعر ہے۔ ہماری قومی زبان اردو کی ابجد مرثیہ سے شروع ہوتی ہے اور اس کے ادب عالیہ میں بلند ترین ادب اگر کہیں ملتا ہے تو وہ مرثیہ ہے۔ تاجدار دکن قطب شاہ سے سلطان فن حضرت انیسؔ تک کربلائی ادب کا یہ حصہ مسلسل ترقی کرتا چلا گیا ہے۔ دکن کے سینکڑوں شاعروں کے مرثیے ہماری ادبی تاریخ کا گراں بہا خزانہ ہیں۔ میں تاریخ عزاداری اور متعدد مقالات میں اس موضوع پر لکھ چکا ہوں، دکنی دور کے بعد دہلی اور لکھنو میں بکثرت مرثیہ گو پیدا ہوا جس کا تذکرہ بھی میں نے شائع کر دیا ہے۔ وجہیؔ، نصرتیؔ، ولیؔ، میرؔ، سوداؔ، جرأتؔ، حسرتؔ، سکندرؔ، حسنؔ اور خلیقؔ کے بعد مرثیہ کی ہیئت اور ٹکنیک میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی، ضمیرؔ فصیحؔ خلیقؔ نے اس کی نئی حدیں مقرر کیں، نئے رنگ عطا کیے اور مرثیہ کو "بَین" اور سادگی سے شان و شوکت، قوت و حرارت، فکر و اخلاق، فن اور تخیل کے نئے خلعت عطا کیے۔ انیس و دبیر نے متقدمین کے اس تجربے کو آخری صورت بخشی اور مرثیہ ایک صدی کے اندر اندر اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔

انیس و دبیر کے بعد نفیس، اوج، عروج و رشید، عشق اور ان بزرگوں کے معاصر حضرات نے کوششیں کر کے بہت سے نئے پہلو نکالے مگر انیس و دبیر نے جو خط کھینچا، مرثیہ کی، جو حدیں مقرر کیں وہ پتھر کی لکیر بن گئیں اور آج تک کمال مرثیہ یہی نقطۂ آخر سمجھا جا رہا ہے اوج و عروج کے بعد رشید اور رشید کے بعد ربع صدی ایسی گذری جس میں ان کے جانشین ندرت اظہار کے مقابلے کرتے رہے۔ مگر نئی راہ نہ نکال سکے۔ جنگ عظیم کے بعد لکھنؤ کے دبستان میں نئی تحریکیں زور پکڑتی گئیں۔ صفی و عزیز کی زیر سرکردگی شعر میں افادیت کا شعوری نقطۂ نظر پھیلا، مطالعہ و مباحثہ مے تجربوں کے فوائد واضح کیے اور دوسرے شعرا کی طرح مرثیہ میں نئی زندگی کی روشنی آئی۔ پرانوں کے مقابلے میں بالکل نئے اور نو آموز شاعروں کی نسبت سے پرانوں نے مرثیہ کو فلسفہ دیا حکیم آشفتہ مرحوم، جناب خبیر، جناب نسیم امروہوی نجم آفندی، رزم رودلوی جیسے متعدد حضرات سامنے آئے لیکن جناب آل رضا صاحب اور جناب جوش ملیح آبادی نے ایک نئے تیور سے مرثیہ لکھا للکار، فکر انگیزی، خیالات کا تسلسل فلسفہ کی تشریح اور عمل کی دعوت ان کے فن کا مدعا تھی، ملک و ملت کے حالات علم و عمل کے پھیلاؤ، نئی نسل کے ابھرتے تقاضوں نے اس انداز کو پسند کیا اور مرثیہ نگاری کے فن نے دوسری کروٹ لی۔

ظاہر ہے کہ فنی مرثیہ معیاری شاعری سے اونچے درجہ کی چیز ہے

مرثیہ نگار کو مرثیہ لکھنے سے پہلے غزل، قصیدہ، رباعی، بلکہ مثنوی و نظم میں مشق و مہارت حاصل کرنا پڑتی ہے۔ غزل خود مشکل ترین صنف سخن ہے۔ اچھی غزل اچھا شاعر کہہ سکتا ہے۔ مگر معیاری اور نک سک سے درست، فنی نزاکتوں سے آراستہ اور صحیح معنوں میں غزل کہنا آسان نہیں۔ فنی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کا قصیدہ بڑی جگرکاوی اور بڑی استادی کا کام ہے۔ شاعر جب ان مرحلوں سے گذر کر ان آنچوں نکل کر طبیعت کو کندن اور شعر کو جلا دینے کی صلاحیتیں حاصل کر لیتا ہے جب جاکر مرثیہ گوئی کی سرحد میں داخل ہوتا ہے پھر اسے تمام اصناف سے رُخ موڑنا اور تمام اقسام شعر سے رشتہ توڑنا پڑتا ہے۔ مرثیہ، یکسوئی چاہتا ہے، مرثیہ کے لئے محنت درکار ہے۔ مرثیہ فن بھی ہے ارتقائے فن بھی ہے۔ مرثیہ راستہ بھی ہے اور منزل بھی۔ مرثیہ ایک طرف فن کار کی نادرہ کاری کا آئینہ بھی ہے اور دوسری طرف خود ایک مقصد بھی ہے۔ جو شاعر جلا سازی، نگینہ تراشی اور مرصع کاری کی مشق کرتے ہیں، ان کی محنتوں کا حاصل کچھ اور ہے اور جو مرثیہ کو مقصد سمجھ کر سادگی، بیان غم اہل بیت علیہم السلام اور عبادت کے زاویے سے مرثیہ لکھتے ہیں ان کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔ وہ مجلس اور زینت مجلس کو سامنے رکھتے ہیں۔ وہ اسے ثواب کا کام سمجھتے ہیں، وہ اس کا صلہ خدا سے چاہتے ہیں، ان کے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ اسے ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ وہ اس کا

صلہ خدا سے چاہتے ہیں۔ ان کے سامنے واقعۂ کربلا کا دینی پہلو ہوتا ہے۔ وہ رونے رلانے کو باعث شرف جانتے ہیں۔ ایسے باخدا لوگ بہت ہیں، خصوصاً مرثیہ نگاری کی فہرست میں ان سب لوگوں کے نام ہیں جن کی نیت ثواب اور ذکرِ غم حضرت سید الشہدا علیہ السلام کا ہے۔

جناب آغا سکندر مہدی شہر دانش و بینش لکھنؤ کے ماحول میں پروان چڑھے ان کا وطن رائے بریلی بھی گویا لکھنؤ کا ایک محلہ تھا۔ جس کے تمام مذہبی و ثقافتی رشتے لکھنؤ ہی سے مربوط تھے۔ آغا سکندر مہدی صاحب نے بچپنے سے اپنے وطن میں بہتر سے بہتر مرثیہ گو اور مرثیہ خوانوں کو سُنا، لکھنؤ میں شیعہ کالج ان کی تعلیم کا سرچشمہ تھا، وہ یہاں کے ہونہار، جواں ہمت اور باعمل طالب علم تھے۔ انہیں ادب و مذہب سے محبت ورثہ میں ملی۔ وہ کالج میں مقرر اور اچھے کھلاڑی کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ لیکن ان کے جبلی اور فطری رجحانات برقرار رہے، ان کے ادبی ذوق میں عمر کے ساتھ پختگی اور ان کے جذبات دیانت میں بلندی پیدا ہوتی رہی۔ آخر ذوق و مذہب نے شعری راہوں میں مرثیہ کی منزل تلاش کی۔ ان کے سفر کی ایک منزل ہمارے سامنے ہے۔ آغا سکندر مہدی کا یہ تازہ مرثیہ انچاس بندوں پر مشتمل ہے۔ جس کے دس بند شاعر اور فنِ شعر سے متعلق ہیں

پندرہ بند نعت پیغمبرؐ میں ہیں۔ آخری بند سے گریز ہے کہ حضورؐ کی تعلیمات سے

ٹھوکریں کھانے لگا جا بجا، عفریت غرور
حق کے آنے سے ہوئی ظلمت باطل کا عبور
دم بخود، سر بگریباں تھا پرانا دستور
دیں کی ترویج سے روشن ہوا انساں کا شعور
نفس امارہ سے جو برسر پیکار رہوا
حق کی نظروں سے وہی صاحب کردار رہوا

اور پھر صاحب کردار "حر" کی روشن ضمیری، جرأت، حق پرستی اور عرفانی قوتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

نور حق دل میں لئے حُرؔ، سوئے شبیر چلا
بخشوانے کے لئے شاہ سے تقصیر چلا
ہاتھ رومال سے باندھے ہوئے دلگیر چلا
زیر لب پڑھتا ہوا آیت تطہیر چلا
جذبۂ عشق حقیقی نے ابھارا اس کو
مل گیا سورۂ توبہ کا سہارا اس کو

حر کی آمد، معافی، اذن جہاد کا تذکرہ کرتے ہوئے، جنگ، تلوار، اور شہادت کے مناظر بڑی سادگی سے لکھ کر اس بند پہ مرثیہ ختم کیا ہے:

لاشۂ حر پہ جو سرور نے بہائے آنسو
دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو
چشم خورشید نے پلکوں سے اُٹھائے آنسو
مرنے والے نے کلیجہ سے لگائے آنسو
حُر کا اخلاص تھا، اعمال جو مقبول ہوئے
اشک معصوم کے، میّت کیلیئے پھول ہوئے

مجموعی طور سے یہ مرثیہ، آغا صاحب کے جذبۂ محبّت حرُ کا آیئنہ ہے وہ ہے جس کے لئے آغا صاحب نے کہا ہے :

ذہن فنکار میں جس دم کہ بکھرتے ہیں نقوش
صوُرتِ گیسوئے خمدار سنورتے ہیں نقوش
نقد کی آنچ سے سو بار گذرتے ہیں نقوش
تب کہیں تاج محل بن کے ابھرتے ہیں نقوش
عظمت فکر رہی، خاک کا پیکر نہ رہا
آیئنہ رہ گیا دنیا میں سکندر نہ رہا

میرے خیال میں آغا صاحب زود گو اور تیز نویس شاعر ہیں انہوں نے بہت مختصر سی مدّت میں پانچ مرثیے لکھ کر اپنی درّاکی اور بلند پردازی کا ثبوت دیا ہے۔ انھیں شعر پر قدرت ہے، ان کا ذوق لطیف اور مطالعہ بھی اچھا ہے۔ وہ روایت کو پسند کرتے ہیں۔ زیر نظر مرثیہ میں فن

کی قدیم روایت کا عکس ہے۔ انیس و دبیر کی شاہراہ پر چلنا جس قدر آسان ہے اس سے زیادہ محنت طلب اور دشوار بھی ہے۔ مرثیہ کی یہ شاہراہ ایک صدی سے قافلوں کی گذر گاہ ہے۔ بے شمار مرثیہ گو اس راستے پر آئے۔ سینکڑوں شاعروں نے اس ہیئت و اسلوب کو سرمشق سخن قرار دیا۔ اور سب ماجور و مثاب ہوئے۔

مرثیہ کی اصل غرض و غایت ثواب و خوشنودی خدا ہے۔ مرثیہ گو کے مخاطب خاص مزاج رکھتے ہیں۔ اس لئے شاعر ان کو سامنے رکھتا ہے وہ مجلس میں فضائل و مصائب بیان کرتا ہے۔ خود روتا اور دوسروں کو رلاتا ہے۔ مجلس اور ذاکر کے سامنے رضائے خدا، عبادت کا عمل اور کربلا کا تذکرہ ہوتا ہے۔ وہ جذبۂ ایمان کو ابھارتا، اصول اخلاق کو روشن کرتا اور سیرت شہدائے کربلا کی یاد دلا کر اہل مجلس کو مآل مجلس سے بہرہ ور کرتا ہے۔ حاضرین مجلس اپنے اپنے ذوق و معیار کے مطابق مرثیہ سنتے اور اس سے اثر لیتے ہیں۔

جناب آغا صاحب کا یہ مرثیہ بھی مخصوص حضرات کے نظریات اور ہم محبین محمدؐ و آل محمدؐ کے لئے اسی قسم کی ایک پیش کش ہے۔ خداوند عالم آغا صاحب کے توفیقات

ہیں اضافہ فرمائے ۔ اور اُنہیں فن مرثیہ گوئی میں اس سے بھی بلند ترین مدارج تک پہنچائے ۔ اس دور میں یہ جذبہ و خلوص لائق صد احترام ہے ۔ بلکہ ان جیسے ذہن افراد کا مرثیوں کی طرف رغبت ایک فالِ نیک ہے ۔ مَیں آغا صاحب کو ان کی حُسنِ نیّت پر مبارک باد اور ان کے مرثیہ کو عزّت کی نظر سے دیکھتا ہوں ۔ مجھے یقین ہے کہ آغا صاحب بہت جلد ایسے ہی مثالی مرثیہ لکھ کر فکر و فن کو عروج بخشیں گے ۔

خاکسار

مرتضیٰ حسین عفی عنہ

۱۵ ر مغل پورہ لاہور

۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطلع

آج پھر کاوشِ آرائشِ فن کرتا ہوں

سُرخیِ خونِ جگر جلوہ فگن کرتا ہوں

گُلِ افکار سے معمورِ چمن کرتا ہوں

زورِ تخیل کو پابندِ سخن کرتا ہوں

نفسِ مضموں جو مرا طور سے بالا ہوگا

زورِ تحریر سے مجلس میں اجالا ہوگا

مشعلِ راہ جو ہے روشنیٔ داغِ جگر
گوشے گوشے میں نظر آتی ہے تنویرِ سحر
رابطۂ آفاق جو ہے سلسلۂ تارِ نظر
نوکِ مژگاں پہ چمکتے ہیں ستاروں کے گہر
فکر انگیز جو ہیں شعر و سخن کی باتیں
آج ہو جائیں نہ کیوں عظمتِ فن کی باتیں

بخشا اللہ نے فنکار کو کیا ذوقِ جمال

گُل کو گُلدستہ بنا دیتا ہے گُلچیں کا خیال

آگ پانی میں لگا دیتا ہے شاعر کا جلال

حُسنِ فطرت کا نگہباں ہے مصور کا کمال

موجِ طوفاں کو جو اُنگلی کا اشارہ کر دے

نبضِ وقت کا بہتا ہوا دھارا کر دے

۴

عطر، عطار کی کاوش کا روشن پہلو
کھینچ لیتا ہے جو موتی ہیں گلوں کی خوشبو
اپنی تخلیق میں فنکار سموتا ہے لہو
جذب ہو جاتے ہیں پتھر میں سُلگتے آنسو
سُرخیٔ خونِ جگر، فکر کی افتاد میں ہے
حُسنِ شیریں کی جھلک تیشۂ فرہاد میں ہے

ذہنِ فنکار ہیں جس دم کہ بکھرتے ہیں نقوش

صورتِ گیسوئے خمدار سنورتے ہیں نقوش

نقد کی آنچ سے سو بار گذرتے ہیں نقوش

تب کہیں تاج محل بن کے ابھرتے ہیں نقوش

عظمتِ فکر رہی خاک کا پیکر نہ رہا

آئینہ رہ گیا دُنیا میں سکندر نہ رہا

اپنی تہذیب کا آئینہ ہے فنکار کا فن

ہیں امیں عہدِ گذشتہ کے یہ آثارِ کہن

ہاں مگر یہ ہے حقیقت کہ کرے لاکھ جتن

پا نہیں سکتا کوئی مرتبۂ اہلِ سخن

عصرِ حاضر کو یہ ماضی سے مِلا دیتا ہے

چھُپ کے الفاظ کے پردے میں صدا دیتا ہے

۶

آج مجلس میں ہے پھر گرمیٔ بازارِ سخن

فکر انگیز ہے کیا شدّتِ افکارِ سخن

رشکِ دربارِ جہاندار ہے دربارِ سخن

ہیں مُقرِ مرثیہ گوئی کے طرفدارِ سخن

طلبِ خیر ہو تب دُرِّ نجف ملتا ہے

ورنہ کب مرثیہ گوئی کا شرف ملتا ہے

جوش میں آج ہے پھر چشمۂ فیضِ یزداں
قلبِ مومن کو جلا دیگی شعاعِ ایماں
اہلِ دانش کے لئے فکر کا ہوگا ساماں
زورِ تحریر بڑھائیں گے دلیل و برہاں
خُون اُگلے گا قلم، ذکرِ شہیداں ہو گا
مائی ناطقہ، انگشت بہ دنداں ہو گا

غوطہ زن قلزمِ عرفاں میں ہے غواصِ قلم

حُسنِ بے پایاں سے روشن ہے بساطِ عالم

چشمِ بینا کے تصور میں ہے تصویرِ ارم

وہ تجلّی ہے کہ جلتے ہیں نگاہوں کے قدم

دم بخود عقل ہے جلووں کی فراوانی سے

دل پہ قابو نہیں جذبات کی طغیانی سے

اوجِ گردوں پہ جو پہنچا ہے قلم کا اقبال

ضَو فگن نورِ ہدایت سے ہے قندیلِ خیال

دامنِ فکر میں ہے عالمِ امکاں کا جمال

حُسنِ ترتیب سے الفاظ نے پایا ہے کمال

برقِ تخئیل جو الفاظ میں لہراتی ہے

صاف جذبات کی تصویر نظر آتی ہے

ہے مرے پیشِ نظر ذکرِ شہنشاہِ حجاز
کیوں نہ معراج پہ ہو فکرِ رسا کی پرواز
حاصلِ کُن فیکوں، جلوۂ حرفِ آغاز
بس یہی ہے مرے مولا کے کرم کا اعجاز

سانس لینا بھی یہاں وقفِ عبادت ہوگا
باعثِ رحمتِ حق ذکرِ رسالت ہوگا

ذاتِ سرکارِ دو عالم ہے خدا کی رحمت

باعثِ عظمتِ کونین وجودِ نعمت

حسنِ تخلیق کا آئینہ بشر کی عظمت

آپ کے مدح کی ثناخواں ہے زبانِ قدرت

جس جگہ تذکرۂ شاہِ زماں ہوتا ہے

بیت معمور سے روشن وہ مکاں ہوتا ہے

آپ کی ذات پہ ایماں ہے خدا پر ایماں
نطق سرکارِ دو عالم ہیں، حدیث و قرآں
منکرِ ذاتِ محمدؐ ہے وہ کافر ناداں
جس کی قسمت میں ہے محرومیِ فیضِ یزداں

ڈھونڈتا نور ہے جو فکر کی باریکی میں
مثلِ ابلیسؑ بھٹکتا ہے وہ تاریکی میں

دینِ اسلام کی بنیاد ہے ایمان بالغیب

صرف اللہ ہے، اللہ کی ذات بے عیب

لامکاں، ربِ جہاں، خالقِ یکتا لاریب

بندے اس کے ہیں سبھی موسیٰ و عیسیٰ و شعیب

جب کبھی آئے ہیں، جتنے بھی نبی آئے ہیں

اس کی توحید کی دُنیا میں خبر لائے ہیں

ارفع و اعلیٰ و اولیٰ ہے وہ قائم بالذات

حیٌّ و قیوم و توانا و مجیبُ الدعوات

ذات میں اپنی احد ہے تو ہے وہ احد بہ صفات

کفر اس کی ہے نفی دین ہے اسکا اثبات

ذاتِ واجب کی عنایات کا مظہر ہیں حضور

اس کا شاہد ہے خدا نور کا پیکر ہیں حضور

مومنو! معرفتِ حق کا وسیلہ ہیں حضور
کُل کے مُختار ہیں یہ، باقی زمانہ مجبُور
دے چُکا اپنی رضا، اُن کو خُداوند غفور
اس منظور ہے وہ، جو بھی ہے انکو منظور

دین انکا ہے، خدا انکا، رسالت انکی
طاعتِ حق ہے حقیقت میں اطاعت انکی

ہر عمل انکا، خدا اپنا عمل فرمائے

جو کہیں بات یہ، فرمانِ خدا کہلائے

عرش جو آپ کی انگلی کا اشارہ پائے

چاند دو ٹکڑے ہو، خورشید پلٹ کر آئے

مُنحرف ذاتِ الٰہی سے اللہ کی شیطان نہ تھا

بات اتنی تھی فقط آپ پہ ایمان نہ تھا

آپ کی ذات پہ ایمان ہے اصلِ ایماں

آپ کی ذات کا عرفان ہے اصلِ ایماں

آپ کی ذات کا ایقان ہے اصلِ ایقاں

آخرت کا بھی ساماں ہے اصلِ ساماں

یہ وہ دولت ہے کہ مفلس بھی تونگر ہو جائے

اصلِ ایماں ہو تو بے ذر بھی ابوذر ہو جائے

جو بھی سرکارِ رسالت کا پرستار رہا
چشمۂ فیضِ الٰہی سے وہ سرشار رہا
مومن و متّقی و عابد و دیندار رہا
سالکِ راہِ رضا، حق کا طلبگار رہا

نام دنیا میں رہا، صاحبِ ایمان بنا
اہلِ جنّت میں ہوا، ہمسرِ سلمان بنا

یوں تو اللہ کے قائل تھے نصاریٰ و یہود
پاس اُن کے بھی تھے احکامِ شریعت موجود
اور سمجھتے تھے خداوند عُلا کو معبُود
زعم میں اپنے تھے پابندِ قیام اور قعود
اپنی جانب میں بڑا ذکرِ خدا کرتے تھے
فرض طاعت کا ادا، صبح و مسا کرتے تھے

ہاں مگر ذاتِ محمدؐ پہ جو ایمان نہ تھا
رسمِ دُنیا میں گرفتار تھے ایقان نہ تھا
دِل تھے بے نُورِ توفیضان کا اِمکان نہ تھا
بخُدا ان میں کوئی صاحبِ ایمان نہ تھا

اپنے مطلب کی جو باتیں تھیں وہ چُن لیتے تھے
ورنہ احکامِ شریعت کو بدل دیتے تھے

ابنِ مریم کو سمجھتے تھے خُدا کا بیٹا
جانے کیا حضرت موسیٰ کو بنا رکھا تھا
مُستحق ہیں وہی جنت کے، تھا اُن کا دعویٰ
لَب پہ تھا نامِ خُدا، شرک تھا سینوں میں چھُپا

حق و انصاف سے اخلاص سے دل عاری تھے
عظمتِ نورِ محمدؐ کے وہ اِنکاری تھے

اُن کے انکار سے سرکار کی عظمت نہ گئی

دہر میں احمد مختار کی عظمت نہ گئی

دین کے قافلہ سالار کی عظمت نہ گئی

سید و سرور، سردار کی عظمت نہ گئی

پرچم حق کو لئے نُور ھدایت اُبھرا

دور باطل ہوا خورشید رسالت اُبھرا

دعوتِ حق کو لئے جبکہ بڑھا "خلقِ عظیم"

عدل و انصاف و مساوات کی پھیلی تعلیم

حُسنِ اعمال پہ کی نوعِ بشر کی تعلیم

دینِ اسلام کی قائم رہیں اقدارِ قدیم

عظمتِ نوعِ بشر شرط تھی ایماں کے لئے

عملِ خیر عبادت ہوا، اِنساں کے لئے

ٹھوکریں کھانے لگا جا بجا عفریتِ غرور
حق کے آنے سے ہوئی ظلمتِ باطل کافور
دم بخود سر بہ گریباں تھا پُرانا دستور
دیں کی ترویج سے روشن ہوا انساں کا شعور

نفسِ امارہ سے جو برسرِ پیکار رہا
حق کی نظروں میں وہی صاحبِ کردار رہا

با ایں اوصاف بڑا صاحبِ کردار تھا حُر

پاک طینت تھا، بہادر تھا نکوکار تھا حُر

خلق و آئینِ شرافت کا پرستار تھا حُر

گو تھا اعدا میں مگر حق کا طلبگار تھا حُر

ضربتِ فکر سے باطل کا فسوں توڑ دیا

حُر نے بہتی ہوئی تاریخ کا رُخ موڑ دیا

اہلِ دانش کے لئے حُر کا ہے کردار مثال
حق کے جویا کیلئے کوئی نہیں امر محال
دل میں ہو جذبۂ صادق تو ملے اوج کمال
پائے وہ دولتِ عقبیٰ کہ نہیں جس کو زوال
مردِ حق کوش زمانے کو ہلا دیتا ہے
خاک میں افسرِ شاہی کو ملا دیتا ہے

حُر کی تقدیر کو چمکا گئی عاشور کی شب
مثلِ کافور اڑی دولتِ دنیا کی طلب
آ گیا حق کی طرف، چھوڑ دیا عیش و طرب
صبحِ عاشور کھُلا، رات کی مہلت کا سبب

نوکِ پاپوش پہ تھی سطوتِ دربارِ یزید
فیصلہ حُر کا طمانچہ تھا، بہ رُخسارِ یزید

امتیازِ حق و باطل میں کٹی رات تمام
اک طرف تھا، پسرِ سعد کا لطف و اکرام
دوسری سمت تھا، اخلاقِ حسن خلقِ امام
اس طرح برسرِ پیکار رہی صبح سے شام

عقل حاوی نہ ہوئی عشق کی بے تابی پر
کشمکش ختم ہوئی حق کی ظفر یابی پر

نورِ حق دل میں لئے حُر سوئے شبیر چلا
بخشوانے کے لئے شاہ سے تقصیر چلا
ہاتھ رومال سے باندھے ہوئے دلگیر چلا
زیرِ لب پڑھتا ہوا آیتِ تطہیر چلا
جذبۂ عشقِ حقیقی نے اُبھارا اُس کو
مل گیا سورہ توبہ کا سہارا اُس کو

منزلِ حق کی طرف حُر نے اُٹھائے جو قدم

سامنے آئی نظر روشنی باغ ارم

جذب کرتی تھی اسے بارگہ شاہ اُمم

مسندِ شاہ سے تھا تختِ سلیماں بھی کم

صف سے اعدا کی نکل کر جو وہ دیندار چلا

پیشوائی کے لئے شہ کا علمدار چلا

پہونچا دربار حسینی میں جھکاتے ہوئے سر
گر پڑا قدموں پہ حضرت کے اُٹھائی نہ نظر

اپنے سینے سے لگا کر اسے بولے سرور
حر نہ شرما کہ ترے حال کی ہے مجھ کو خبر

نام شامل ہے ترا حق کے طلبگاروں میں
تا ابد ذکر رہے گا ترا دیندا روں میں

حُر نے کی عرض کہ اے بادشاہِ کون و مکاں

مُجھ کو اس بات کا بالکل ہی نہ تھا وہم و گماں

ورنہ میں مانتا حکم پسرِ سعد کہاں؟

آپ کے قتل کا امت نے کیا ہے ساماں

میں جو باعث ہوا حضرت کی دل آزاری کا

ہوں مقر اپنے گناہوں کا خطا کاری کا

اپنے اعمال پہ خفت ہے، ندامت ہے مجھے
کہہ نہیں سکتا کہ کس درجہ خجالت ہے مجھے
اب کسی بات کی خواہش ہے نہ حسرت ہے مجھے
بس فقط ایک تمنائے شہادت ہے مجھے

مرے مولا مجھے اب اِذنِ وغا مل جائے
جان قرباں کروں، مجھ رضا مل جائے

دی جو حضرت نے رضا حُر سرِ میداں بڑھا
ہو کے مسرور غلام شہِ ذیشاں بڑھا
نصرتِ حق کا لئے سینے میں ارماں بڑھا
زورِ باطل کا گھٹا صاحبِ ایماں بڑھا

برہمی پائی جو لشکر میں ستمگاروں نے
فوج کو اپنی دلاسہ دیا، سرداروں نے

صورت برق چلی حُر جری کی تلوار
اہل باطل کے لئے ہو گیا، جینا دشوار
خاک پر خون میں غلطاں نظر آتے تھے سوار
کچلے دیتے تھے پیادوں کو ہر اک سو رہوار
گر تمہار ن میں کوئی نقش بہ دیوار رہا
حُر کی تلوار کے اک وار سے فی النّار ہوا

قابلِ دید تھا، ہنگامِ وغا حرُ کا جلال

طالعِ فوجِ عدو رن میں ہوا، روبہ زوال

تنِ تنہا سے تھے سب خوف زدہ، یہ تھا کمال

موت کے خوف سے بے حال ہوئے بد اعمال

قلب سینوں میں جو کفار کے تھرّاتے تھے

ایسی دہشت تھی کہ بے موت مرے جاتے تھے

حملۂ حُر سے ہراساں تھا یزیدی لشکر

موت سے ڈھونڈتا پھرتا تھا اک راہ مفر

وہ تلاطم تھا، نہ تھی باپ کو بیٹے کی خبر

نفسا نفسی تھی ہر اک سمت بپا تھا محشر

میمنہ قلب سے لشکر کے جو ٹکراتا تھا

میسرہ فرطِ ندامت سے گڑا جاتا تھا

شمر نے حال یہ دیکھا تو بہت گھبرایا

جسم تھرّا گیا، ماتھے پہ پسینہ آیا

بزدلی فوج کی دیکھی تو بہت شرمایا

روزِ بد حُر دلاور نے اسے دکھلایا

تھرتھراتا تھا کبھی اور کبھی بل کھاتا تھا

آتشِ غیظ میں خود آپ پھنکا جاتا تھا

کھائے جاتا تھا قلق شمر کو رسوائی کا

دل میں کہتا تھا کہ جیتی ہوئی بازی ہارا

حُر کی تلوار نے میداں کا نقشہ بدلا

سب ہوا ہو گئے میداں میں کوئی نہ رہا

نام کرنے کو جو آئے تھے وہ گمنام گئے

فوج کوفے گئی، سردار سوئے شام گئے

اپنے بھاگے ہوئے لشکر سے یہ کہتا تھا لعین

موت سے بچ کے نکل پاؤ گے ہرگز نہ کہیں

اب فقط ایک تدبیر پہ ہے مجھ کو یقیں

توڑ اس زور کا تیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

خالی ترکش کئے اس بات پہ بے پیروں نے

حُر کو گھوڑے پہ سنبھلنے نہ دیا تیروں نے

اسقدر تیر چلے دن شب دیجور

زخم پہ زخم لگے، حُر کا بدن چور ہوا

دی یہ عباس کو آواز "ہیں مجبور ہوا

جان دینا مرا اللہ کو منظور ہوا

کہئے مولا سے مرے حق میں دُعا فرمائیں

عفو اس بندۂ عاصی کی خطا فرمائیں

جبکہ مولا کو ملا حُر دلاور کا پیام
دوڑے مقتل کی طرف بادشہ عرش مقام
ساتھ میں ہو لئے عباس علی مثل غلام
ڈر تھا اس بات کا بے ہوش نہ ہو جائیں امام

پانوں حضرت کے رکابوں میں جو تھراتے تھے
ایسا صدمہ تھا کہ گھوڑے سے گرے جاتے تھے

پہونچے بالیں پہ جو مولا تو عجب حال ہوا

اپنے مہمان کو تیروں میں تڑپتا دیکھا

چار اطراف میں پیاسے کا لہو بہتا تھا

دیکھ کے حال یہ عباس سے بولے مولا

حر کو جلتی ہوئی ریتی سے اُٹھا دو بھائی

مری آغوش میں مہماں کو لٹا دو بھائی

جس گھڑی حُر نے سُنی شاہ زمن کی آواز
جوڑ کے ہاتھوں کو بولا وہ بصد عجز و نیاز
یہ فقط آپ کی ہے چشمِ کرم کا اعجاز
میں ہوں ممنوں بہت ابنِ شہنشاہِ حجاز

آخری وقت میں حضرت کا جو دیدار ہوا
سُرخ رو مجھ سا زمانے میں گنہگار ہُوا

اپنی گستاخی پہ نادم ہوں پشیماں ہوں میں
اُمتی آپ کا ہوں تابع فرماں ہوں میں
کچھ نہیں زادِ سفر، بے سر و ساماں ہوں میں
آخری وقت ہے، کچھ دیر کا مہماں ہوں میں

ہے یقیں اِس کا کہ فردوس بریں جاؤں گا
مُنھ مگر کس طرح سرکار کو دکھلاؤں گا

سُن کے یہ بات تڑپ اُٹھے شہ نیک خصال
کس قدر شاہ کو تھا حُر کی وصیت کا خیال
بخشا مہمان کو خاتون جناں کا رُومال
حُر کی تقدیر کو چمکا گئے اس کے اعمال

روزِ روشن سے سوا نور تھا پیشانی کا
سر پہ سہرا تھا بندھا قوت ایمانی کا

ناگہاں حُر دلاور کو جو ہچکی آئی
پُتلیاں پھر گئیں اور سلب ہوئی گویائی
لویں کانوں کی مڑیں رُخ پہ سپیدی چھائی
حُر نے آغوشِ امامت میں شہادت پائی

سوئے فردوس غلامِ شہ ذیشان گیا
لے کے مولا کی دعا صاحبِ ایمان گیا

لاشۂ حُر پہ جو سرورؑ نے بہائے آنسو
دیکھنے والوں کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو
چشمِ خورشید نے پلکوں سے اُٹھائے آنسو
مرنے والے نے کلیجے سے لگائے آنسو

حُر کا اخلاص تھا، اعمال جو مقبول ہوئے
اشکِ معصوم کے میّت کے لئے پھول ہوئے